Regd. L. No.7243

Phone

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اگست 1984

اس پرچہ میں

سؤر ملک باہر نہیں کئے
جا سکتے -

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ-۲ لاہور

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوع اسلام

ماہنامہ ـــــــ لاہور

بدل اشتراک		قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان ۴۸/- روپے غیر ممالک ۹۸/- روپے	ٹیلیفون :- ۸۸۰۸۰۰ خط وکتابت ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	۴ چار روپے
جلد ۳۷	اگست ۱۹۸۴ء	شمارہ ۸

فہرست

۱۔	لمعات :- اسلامی مملکت کی شرط اول۔	۲
	بے حوثی سے ہتھیا کر لیں۔	۱۲
۲۔	حقائق وعبر :- بھلا ہوا میری مالا ٹوٹی۔ صرف مسلمان نہیں! خوشحال گھرانے کہاں ہیں؟ عورتوں کا تقدس	۱۳
۳۔	۱۹۴۰ء کا ریزولیشن۔ (ایک مملکت یا زیادہ)۔	۱۷
۴۔	اسلامی مملکت کے متعلق تصریحات۔	۲۲
۵۔	سوٗر ملک بدر نہیں کئے جا سکتے!	۲۵
۶۔	ہم بھول کیسے سکتے ہیں؟ ڈاکٹر صلاح الدین اکبر۔	۳۳
۷۔	دو خدا	۴۱
۸۔	کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ (پرویز صاحب)	۴۹
۹۔	ستکمہ بہ (پرویز)	۶۲

ایڈیٹر محمد خلیل؛ ناشر شیخ عبدالحمید۔ مقام اشاعت ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور۔ طبع عبد اشرف پرنٹنگ پریس ۷ ایبک روڈ لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

۱۴ اگست یاد دلاتا ہے

لمعات

(اسلامی مملکت کی بنیادی شرط)

ہم شروع سے مسلمانوں کی مملکت اور اسلامی مملکت میں فرق کرتے چلے آرہے ہیں۔ اسلامی مملکت کے سلسلہ میں جو سوالات سامنے لائے جاتے ہیں اور اس کی جو تفصیلات ہم سے پوچھی جاتی ہیں ان کا تعلق مملکت (یا اس کی حکومت) کی ہیئت کذائی سے ہوتا ہے۔ یعنی وہ جمہوری ہوگی یا آمرانہ۔ جمہوری ہوگی تو اس کا نظام پارلیمانی ہوگا یا صدارتی۔ منتخب ہوگی تو طریق انتخاب کس قسم کا ہوگا ـــــ وغیرہ وغیرہ ـــــ یہ سوالات بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی مملکت (یا دنیا کی کسی اور مملکت) اور اسلامی مملکت میں مابہ الامتیاز ان کی ہیئت کذائی یا شکل وصورت نہیں۔ ان میں حقیقی فرق بنیادی ہے۔ اسلامی مملکت کی بنیاد ایمان پر ہوتی ہے۔ لیکن اتنا کہہ دینے سے بات کا واضح ہو جانا تو ایک طرف، اس سے مزید الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لئے کہ ایمان کا صحیح تصور ہی ہمارے سامنے نہیں ہوتا۔ ہماری نئی نسل کو تو چھوڑ دیئے، قدیم نسل کے ہاں بھی ایمان سے مراد چند الفاظ کا دہرا لینا ہوتا ہے اور بس۔ جہاں تک کاروبارِ حیات اور معاملاتِ حکومت کا تعلق ہے ان پر ایمان کی اثر اندازی کہیں نظر نہیں آتی۔ نہ ہی کسی کے ذہن میں اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب تک اس بنیاد کا صحیح تصور ہمارے سامنے نہ ہو، عام مملکتوں (حتیٰ کہ مسلمانوں کی مملکتوں) اور اسلامی مملکت کا فرق ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اس موضوع پر ہم اکثر و بیشتر لکھتے چلے آرہے ہیں لیکن..... ہماری جدید تعلیم یافتہ نسل کی طرف سے جن سوالات کا اعادہ ہوتا رہتا ہے، ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ ان کی روشنی میں اس موضوع کی اہمیت کو سامنے لایا جائے۔ ان نوجوانانِ ملت کی طرف سے جس قسم کے سوالات پوچھے جاتے ہیں، ان کا محض یہ ہے:-

(۱) قرآن مجید جن باتوں کو اخلاقی محاسن قرار دیتا ہے ـــــ مثلاً سچ بولو، جھوٹ نہ بولو۔ کسی کو فریب نہ دو، چوری نہ کرو، عصمت کی حفاظت کرو، کسی پر ظلم اور زیادتی نہ کرو۔ کسی کو ستاؤ نہیں۔ غریبوں کی مدد کرو۔ محتاجوں کے ساتھ ہمدردی کا سلوک کرو۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایک شخص ان امور کا پابند ہے لیکن وہ نہ خدا کو مانتا ہے نہ وحی کو، نہ رسالت پر ایمان رکھتا ہے نہ آخرت پر۔ تو اس کے اس انکار سے اس کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے اور جو شخص ان امور پر ایمان رکھتا ہے اس میں اور اول الذکر میں عملی نقطہ نگاہ سے کیا فرق ہوتا ہے

(۲) ایک قوم اپنے ہاں (مثلاً) وہی اقتصادی نظام رائج کر لیتی ہے جسے قرآن تجویز کرتا ہے لیکن وہ قوم خدا اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتی۔ تو اس کے اس اقتصادی نظام کو اسلامی کیوں نہیں کہا جاسکتا۔ یا

(۳) مسلمانوں کی کوئی مملکت ایسے معاشی نظام کو اپنے ہاں رائج کر لیتی ہے جسے قرآن نے تجویز کیا ہے

اور باقی شعبوں میں اس کا التزام نہیں کرتی، تو کیا اس مملکت کو اسلامی مملکت کہا جاسکے گا۔ اگر اسے اسلامی نہیں کہا جائے گا، تو ایک مملکت یا ایک نظام (سسٹم) کس وقت اسلامی کہلانے کا مستحق سمجھا جائے گا۔

یہ ہے ملخص، ان سوالات کا جو ہمیں اس سلسلہ میں موصول ہوتے رہتے ہیں۔ آیئے، ہم ان پر سطح سے ذرا نیچے اتر کر غور کریں۔

ان سوالات، اور اسی قسم کے دیگر شکوک و شبہات کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ایمان کا صحیح مفہوم ہمارے سامنے نہیں۔ اور یہ شکوک اس وقت اور بھی بڑھ جاتے ہیں جب ہمارا نوجوان طبقہ دیکھتا ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، فلہٰذا، خدا، رسول، وحی، آخرت پر ایمان کے دعویدار ہیں، اخلاقی اعتبار سے وہ بالعموم، ان لوگوں سے بھی پست ہیں جنہیں یہ دہریئے اور ملحد کہتے ہیں۔ بنابریں سب سے پہلے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ایمان کہتے کسے ہیں۔ ایمان چند الفاظ کے دہرا لینے کا نام نہیں۔ ایمان، انسانی زندگی کے متعلق ایک خاص نظریہ، یا (ATTITUDE) کا نام ہے۔ مثلاً انسانی زندگی کے متعلق ایک نظریہ یہ ہے کہ انسانی بچہ، عام حیوانی بچوں کی طرح، نر و مادہ کے جنسی اختلاط سے وجود میں آجاتا ہے۔ وہ طبیعی قوانین کے تابع زندگی بسر کرتا ہے — کھاتا، پیتا، سوتا، جاگتا اور افزائشِ نسل کرتا ہے۔ اور اس کے بعد، طبیعی قوانین کے مطابق مر جاتا ہے اور اس طرح اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ انسان ایک متمدن حیوان واقع ہوا ہے، اس کے لئے اس کا سوسائٹی میں رہنا ضروری ہے۔ اور سوسائٹی میں رہنے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ سوسائٹی کے متعین کردہ قوانین کی اطاعت کرے۔ سوسائٹی کے قوانین خود سوسائٹی کے افراد کے وضع کردہ ہوتے ہیں جو مصلحت کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔

ایک نظریۂ زندگی یہ ہے، اور دوسرا نظریہ یہ کہ جہاں تک طبیعی زندگی کا تعلق ہے، انسان اور حیوان میں بے شک کوئی فرق نہیں، لیکن انسان کی زندگی صرف طبیعی زندگی نہیں۔ اس کی طبیعی زندگی، حیات کے ارتقائی پروگرام کی ایک کڑی ہے۔ اس کی آخری کڑی نہیں۔ اس سلسلہ کو آگے بھی جاری رہنا ہے۔ طبیعی سطح پر زندہ رہنے کے لئے تو طبیعی قوانین کافی ہیں، لیکن ارتقاء کی اگلی منزل تک پہنچنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے، طبیعی قوانین سے ماوراء ایک اور ضابطۂ قوانین کی ضرورت ہے، جنہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ یہ اقدار، نہ کسی فرد کی وضع کردہ ہیں نہ سوسائٹی کی۔ یہ ازلی و ابدی ہیں اور انسان کو ان کا علم اس وحی کی رو سے حاصل ہوتا ہے جو انبیاء کرامؑ پر نازل ہوتی تھی۔ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتسم ہوتا ہے۔ اگر اس کے اعمالِ حیات مستقل اقدار کے مطابق ہیں تو وہ زندگی کی اگلی ارتقائی منزل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اسے اخروی زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ زندگی کی پست سطح میں محبوس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اعمال کے ان اثرات کے لئے نہ پولیس کی ضرورت ہوتی ہے نہ عدالت کی۔ یہ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے از خود مرتب ہوتے رہتے ہیں، اور سامنے آتے رہتے ہیں۔

یہ ہے زندگی کا دوسرا نظریہ۔ اس نظریہ کو علم و بصیرت اور عقل و فکر کی رو سے مبنی بر صداقت اور حقیقت سمجھنا اور قدم قدم پر اسے پیشِ نظر رکھنا، ایمان کہلاتا ہے۔ اس کے برعکس طبیعی زندگی کے نظریۂ حیات کو قرآن کفر سے تعبیر کرتا ہے۔ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ (۴۷/۱۲) "جو لوگ

حیوانات کی طرح کھاتے پیتے (اور مر جاتے) ہیں وہ کفر کا نظریۂ حیات رکھتے ہیں"۔ یہ دونوں نظریاتِ حیات ایک دوسرے سے متمیز، باہمدگر متضاد اور منفرد ہیں۔ یعنی ان میں باہمدگر آمیزش نہیں ہو سکتی۔ ایمان کے نظریۂ حیات کے ساتھ کفر کی آمیزش نہیں ہو سکتی، اور کفر کے نظریہ کے ساتھ ایمان کا امتزاج ممکن نہیں؛ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَمِنكُم مُّؤْمِنٌ ۔ (۶۴/۲) خدا نے تمہیں پیدا کیا۔ سو تم میں سے بعض کافر ہیں اور بعض مومن"۔ سائنس کی زبان میں ان نظریات کو فارمولے سمجھنا چاہیئے۔ ایک فارمولا اسی صورت میں اپنے نتائج مرتب کر سکتا ہے جب اُسے بلا آمیزش عمل میں لایا جائے۔ اگر آپ اس فارمولے میں کسی اور فارمولے کی ذرا سی آمیزش بھی کر دیتے ہیں تو وہ اپنا نتیجہ کبھی مرتب نہیں کرے گا۔ قرآن کی اصطلاح میں اس قسم کی آمیزش کو شرک کہا جاتا ہے۔ زندگی، ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اسے مختلف حصوں میں بانٹا ہی نہیں جا سکتا۔ اگر انسانی زندگی کی یہ کیفیت ہو جائے کہ اس کا ایک گوشہ، ایک قسم کے نظریہ کے تابع رکھا جائے اور دوسرا گوشہ کسی دوسرے نظریہ کے تحت، تو اس کا نتیجہ ذلت و خواری کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۔ فَمَا جَزَاءُ مَن يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵) "کیا تم اس قسم کا مسلکِ زندگی اختیار کرنا چاہتے ہو کہ اس ضابطۂ حیات کے ایک حصہ پر ایمان لے آئے اور دوسرے سے انکار کر دیا۔ تم میں سے جو کوئی بھی ایسی روش اختیار کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو گا کہ دنیاوی زندگی میں بھی ذلت و رسوائی اس کے حصے میں آئے گی اور قیامت کے دن وہ شدید ترین عذاب میں مبتلا ہو گا"۔ اس لئے جو نظریۂ حیات اختیار کرنا ہو، اسے بالکلیہ اختیار کیا جائے گا۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ۔ (۲/۲۰۸) "اے جماعتِ مومنین! تم سلامتی بخش نظامِ حیات (اسلامی نظام) میں پورے کے پورے بہ تمام و کمال، داخل ہو"۔ اسی صورت میں تم اس کے انسانیت ساز نتائج سے متمتع ہو سکو گے۔

پھر اسے بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ پیدائشی طور پر، نہ کوئی انسان مومن ہوتا ہے نہ کافر۔ ہر شخص کو ایمان یا کفر کا نظریہ خود اختیار کرنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ۔ یا ۔ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا کہتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو ایمان کا نظریہ اختیار کرتے ہیں، یا وہ لوگ جو کفر کا نظریہ اختیار کرتے ہیں۔ یا مَن يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ ۔ جو شخص غیر خدائی نظریۂ زندگی سے انکار کرتا ہے اور خداوندی نظریۂ حیات اختیار کرتا ہے۔ یعنی ان نظریات کو بالارادہ اختیار کیا جاتا ہے۔ نہ کوئی شخص بمجرد اس امر کے کہ وہ مسلمانوں کے ہاں پیدا ہو گیا، مومن قرار پا سکتا ہے، نہ غیر مسلموں کے ہاں پیدا ہونے والا، پیدائش کے اعتبار سے کافر۔ واضح رہے کہ قومی نقطۂ نگاہ سے، یہ لوگ مسلمان اور غیر مسلم اقوام سے متعلق سمجھے جائیں گے، لیکن قرآنی مقاصد کے لئے انہیں ایمان یا کفر کا نظریہ، اپنے ارادے اور فیصلے سے اختیار کرنا ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ان لوگوں سے بھی جو پیدائشی طور

ﷺ مثال کے طور پر کمیونزم میں کیپٹل ازم کی آمیزش کر دیجیئے۔ وہ نہ کمیونزم رہے گا نہ کیپٹل ازم۔ کوئی ازم بھی کسی متضاد ازم کی شرکت سے اپنے نتائج پیدا نہیں کر سکتی۔

پر مسلمانوں کی قوم سے متعلق ہوں، ایمان اختیار کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ سورۃ النساء میں ہے — یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ ..... (۴/۱۳۶) "اے مسلمانو! تم ایمان لاؤ اللہ پر، اور اس کے رسول پر، اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی، اور ان کتابوں پر جو اس سے پہلے خدا کی طرف سے نازل ہوئی تھیں..... اور آخرت کی زندگی پر — سورۃ الحدید میں ہے، یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِہٖ..... (۵۷/۲۸)۔ "اے مسلمانو! تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور ایمان لاؤ اس کے رسول پر"۔ دوسرے مقام پر ہے "اے مسلمانو! کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت کا پتہ نشان بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دلائے"۔ وہ یہ ہے کہ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ..... (۶۱/۱۱) "تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر"۔ آپ نے غور فرمایا کہ وہ پیدائشی مسلمانوں سے بھی ایمان لانے[1] کا تقاضا کرتا ہے۔ اس لئے کہ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) ایمان ایک خاص نظریۂ حیات کو علیٰ وجہ البصیرت اختیار کرنے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نام ہے۔ یہ انسانی قلب و دماغ کا ایک مثبت عمل (POSITIVE ACTION) ہے۔

پھر اسے بھی سمجھ رکھنا چاہیئے کہ ایمان رسماً زبان سے چند الفاظ دہرا دینے اور اس طرح امتِ مسلمہ کے ساتھ وابستہ ہو جانے کا نام نہیں۔ وہ بدوی قبائل جنہوں نے اسلامی مملکت کی شوکت و عظمت دیکھ کر اس کی فرماں پذیری قبول کر لی تھی، اپنے آپ کو مومن کہنے لگ گئے تھے۔ حضورؐ سے کہا گیا کہ ان سے کہہ دو کہ لَمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ ..... "تم ابھی ایمان نہیں لائے، کیونکہ وہ تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔ تم سردست اتنا ہی کہو کہ ہم نے اس مملکت کے سامنے سرِ تسلیم کر دیا ہے" — اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ (۴۹/۱۵) "مومن تو وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں اور اس نظریۂ زندگی کی صداقت کے متعلق ان کے دل میں کسی قسم کا شک یا اضطراب پیدا نہیں ہوتا۔ اور وہ اللہ کی راہ میں اپنی جان اور مال سے مصروفِ جد و جہد رہتے ہیں۔ یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے دعویٰ کو اپنے عمل سے سچا کر دکھاتے ہیں"۔

اس مقام پر اس حقیقت کا واضح کر دینا ضروری ہے کہ جو اعراب اس طرح زمرۂ امت میں شامل ہوئے تھے اور قرآنی نظریۂ زندگی ہنوز ان کا جزوِ حیات نہیں بنا تھا، قرآن نے یہ کہہ کر انہیں الگ نہیں کر دیا تھا کہ وہ جنس کا سد ہیں۔ انہیں امتِ مسلمہ کے افراد کہلانے کا کوئی حق نہیں۔ انہیں باقی مسلمانوں کی طرح امت کے افراد قرار دیا گیا اور تسلیم کیا گیا تھا۔ اس کے بعد مناسب تعلیم و تربیت سے ان میں ایسی قلب ماہیت ہوئی کہ وہ اسلام کے جانثار سرفروش مجاہد بن گئے۔ یہ ضمنی نکتہ تھا۔ اس کے بعد اصل موضوع کی طرف آجایئے۔

اس سے ہمارے سامنے یہ حقیقت بھی آجاتی ہے کہ ایمان اسی وقت ایمان کہلا سکتا ہے جب اس کا مظاہرہ انسانی اعمال و کردار سے ہو۔ بات سیدھی بھی واضح۔ ایمان کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ انسانی جد و جہد صحیح نتائج پیدا

---

[1] "ایمان لانے" کے الفاظ ابہام اور التباس پیدا کرتے ہیں۔ اس کی جگہ کہنا یہ چاہیئے کہ "جو لوگ قرآنی نظریۂ حیات اختیار کرتے ہیں"۔

کرے۔ اگر جد و جہد ہی نہ ہو تو ایمان، نتائج کیا پیدا کرے گا؟ آپ زراعت سے متعلق قوانین سے ہزار واقفیت رکھیں؛ اور ان قوانین کی صداقت پر آپ کو لاکھ یقین ہو، آپ کی زمین سے فصل اسی وقت پیدا ہوگی جب آپ ان قوانین کے مطابق کھیتی کریں گے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کی وضاحت قرآنِ کریم نے بے شمار مقامات پر کی ہے۔ مثلاً سورۂ عنکبوت میں ہے۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (۲۹/۲)۔ کیا لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ وہ صرف اتنا کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں، چھوڑ دیئے جائیں گے اور وہ ان کٹھالیوں میں سے نہیں گزارے جائیں گے" (جن سے گذر کر سونا کندن بنتا ہے) سورۂ توبہ میں ہے کہ جب منافقین آکر کہتے تھے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں تو ان سے کہا جاتا تھا کہ قُلِ اعْمَلُوْا فَسَیَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ۔ (۹/۱۰۵)۔ (تمہارا دعویٰ ایمان ہم نے سن لیا ہے۔ اب) تم کچھ کر کے دکھاؤ۔ خدا اور اس کا رسولؐ اور جماعت مومنین، تمہارے کام دیکھ کر (اس امر کا فیصلہ کریں گے کہ تم واقعی ایمان لے آئے ہو یا یہ یونہی رسماً الفاظ کا دہرا دینا ہے)۔ سورۂ انعام میں ہے کہ جب قانونِ مکافات کی رو سے، لوگوں کی غلط روش کی پیدا کردہ تباہیاں سامنے آجائیں گی تو اس وقت نہ تو اس شخص کا ایمان اسے کچھ فائدہ دے گا جو ان تباہیوں کو دیکھ کر ایمان لائے گا۔ اَوْ كَسَبَتْ فِیْٓ اِیْمَانِهَا خَیْرًا (۶/۱۵۸)" اور نہ ہی اس شخص کا ایمان جس کے ایمان کے ساتھ اچھے اعمال شامل نہ ہوں گے"۔ اسی سورۃ میں دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ خدا لوگوں کے خالی دعواے ایمان کی بنا پر ان کا دوست اور کارساز نہیں ہوتا۔ هُوَ وَلِیُّهُمْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔ (۶/۱۲۸) "وہ ان کے اعمال کی وجہ سے ان کا دوست ہوتا ہے"۔ یہ "ایمان بلا عمل" والے ہی ہیں جن کے متعلق کہا کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ (۲/۸) "لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں لیکن وہ مومن ہوتے نہیں"۔ ایمان، انسانی اعمال کے لئے جذبۂ محرکہ ہوتا ہے جو جذبہ اعمال کا محرک نہیں بنتا، وہ ایمان ہی نہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ ہیں ـــــ مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل

———(۰)———

یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی ہے کہ ایمان اور عمل کا باہمی تعلق کیا ہے۔ بادنیٰ تعمق یہ بات بھی سمجھ میں آجائے گی کہ طبیعی نظریۂ حیات کی رو سے، اخلاق (MORALS) کا کوئی تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اخلاق کا تصور تو اقدار (VALUES) سے پیدا ہوتا ہے۔ اور جب طبیعی نظریۂ زندگی کی رو سے مستقل اقدار کا کوئی وجود ہی نہیں، تو اس میں اخلاق کا تصور کہاں سے آجائے گا؟ آپ سوچئے کہ جو شخص نہ مستقل اقدار کا قائل ہے اور نہ ہی تسلسلِ حیات یا قانونِ مکافات کو تسلیم کرتا ہے، وہ اگر کوئی "نیک کام" کرتا ہے تو اس کے لئے اس کا جذبۂ محرکہ کیا ہو سکتا ہے؟ ڈین انگے کے الفاظ ہیں:-

> خدا پر ایمان مرکز ہے اور بقائے حیات پر ایمان محیط۔ تمام مسئلہ اخلاقیات کی بس یہی کلید ہے۔ وہ مستقل اقدار جن کے توسط سے ہم خدا تک پہنچ سکتے ہیں، ابد کا

اور غیر فانی ہیں۔

راشڈل، اپنی مشہور کتاب (GOD AND THE ASTRONOMERS) (THE THEORY OF GOOD AND EVIL) میں لکھتا ہے کہ

یہ ناممکن ہے کہ حقیقت کے متعلق ہمارا نقطۂ نگاہ علم الاخلاق کے بنیادی مسائل پر اثر انداز نہ ہو اور اخلاقیات کے متعلق ہمارا نظریہ، تصورِ حقیقت کو متاثر نہ کرے ..... لہٰذا اخلاقی قوانین کے مستقل اور مطلق ہونے کے لئے خدا پر ایمان لانا فک ہے۔

اور (DESTOIEVSKY) نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ

اگر خدا کے وجود کو تسلیم نہ کیا جائے تو دنیا میں سب کچھ جائز ہو جاتا ہے۔[1]

بات بالکل واضح ہے۔ "خدا پر ایمان" نہ ہو تو نظریۂ زندگی طبیعی رہ جاتا ہے اور اس نظریہ کی رُو سے زندگی، حیوانی سطح پر آجاتی ہے۔ حیوانی زندگی، بنیادی جبلتوں (BASIC INSTINCTS) کے سہارے قائم رہتی ہے۔ ان میں سب سے پہلا جذبہ، تحفظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) ہے۔ اس جذبہ کا تقاضا ہے کہ ایک فرد، زیادہ سے زیادہ اپنے لئے سمیٹے، اور چونکہ (حیوانی سطح زندگی پر) مستقل اقدار کا تصور نہیں ہوتا، اس لئے "اپنے لئے زیادہ سے زیادہ سمیٹنے" کے سلسلہ میں "جائز اور ناجائز" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ سوسائٹی کے قوانین کارفرما ہوتے ہیں۔ سوا اوّل تو سوسائٹی کے قوانین سے گریز (EVASION) کی سینکڑوں شکلیں انسان تراش لیتا، اور تراش سکتا ہے۔ دوسرے، سوسائٹی کے قوانین، خود ان افراد کے مرتب کردہ ہوتے ہیں جو "زیادہ سے زیادہ سمیٹنے" میں سب سے آگے ہوتے ہیں۔

اس نظریہ کے حاملین سے یہ توقع کرنا کہ وہ جان مار کر محنت کریں اور اپنی محنت کی کمائی میں سے زیادہ سے زیادہ دوسروں کے لئے دے دیں، اس نظریہ کی اصل و اساس کے خلاف ہے۔ جو شخص یا قوم حیوانی جذبہ تحفظِ خویش کے تابع، دوسروں کا سب کچھ سمیٹنے کی فکر میں ہو، وہ اپنا سب کچھ دوسروں کو کیسے دے دے گی۔ اس نظریۂ زندگی کے حامل، اگر دوسروں کے لئے کچھ دیں گے بھی، تو اس کا جذبۂ محرکہ کچھ اور ہوگا۔ مروجہ قانون کا ڈر، ستائش کی تمنا، صلہ کی امید، سوسائٹی میں ہاپولر ہونے کا جذبہ ـــــ قرآن کریم اس جذبۂ محرکہ کو "رِیاءَ النَّاسِ" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ سورۃ النساء میں ہے۔ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (۴/۳۸) "جو لوگ اپنے مال و دولت کو

---

[1] ان امور کی تفصیل کے لئے دیکھئے۔ پرویز صاحب کی تالیف "انسان نے کیا سوچا"۔ باب اخلاقیات۔

[2] جب اچھے دنوں میں، ہنوز ہمارے سامنے مستقل اقدار کا تصور تھا، تو "ریاکاری" کی اصطلاح فریب کاری کے معنوں میں استعمال ہوتی تھی۔ "وہ بڑا ریاکار ہے"۔ اس کے معنی ہی یہ ہوتے تھے کہ وہ بڑا چالباز اور فریب کار ہے، اب ریاکاری، معاشرہ کا عام معمول ہو چکی ہے۔ اسے اب (POPULARITY) سمجھا جاتا ہے۔

لوگوں کو دکھانے کی خاطر خرچ کرتے ہیں اور اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے"۔۔۔۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم نے کس وضاحت سے یہ بات کہی ہے کہ اگر خدا اور آخرت پر ایمان نہ ہو تو پھر انفاق کا جذبۂ محرکہ ریاءِ النّاس کے سوا کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ دوسری جگہ ہے کہ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا (۹/۹۸) یا ان لوگوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ قانون کے خوف یا حکام کی خوشنودی کے لئے عطیات دیتے ہیں تو چونکہ اس کا جذبۂ محرکہ ان کے دل کا تقاضا نہیں ہوتا اس لئے ایسا محسوس کرتے ہیں گویا "چٹی" بھر رہے ہوں۔ اس کے مقابلہ میں، جو لوگ "انفاق فی سبیل اللہ" کرتے ہیں ۔۔۔۔ یعنی مستقل اقدار اور تسلسلِ حیات پر ایمان رکھتے ہوئے، دوسروں کی نشو و نما کے لئے اپنی کمائی کو کھلا رکھنے والے ۔۔۔۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ جنہیں کچھ دیتے ہیں، ان پر کسی قسم کا احسان نہیں دھرتے، انہیں بطور خیرات نہیں دیتے جس سے ان کے جذبۂ عزتِ نفس کو ٹھیس لگے۔ (۲/۲۶۲) وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان ضرورت مندوں کا حق ہے جسے وہ ادا کر رہے ہیں ۔۔۔۔ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ (۷۰/۲۴)۔ لہٰذا، وہ ان سے کہتے ہیں کہ ۔۔۔ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا۔ (۷۶/۹) "ہم تم سے اس کا نہ کوئی صلہ مانگتے ہیں نہ ہی ہم شکریہ تک کے متمنی ہیں"۔ اسی لئے جماعتِ مومنین سے کہا گیا کہ:-

> جو کچھ تم ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دیتے ہو، اس کا احسان جتا کر اور یوں ان کی عزتِ نفس کو ٹھیس پہنچا کر، اپنے کئے کرائے کو ضائع نہ کرو، اس شخص کی مانند جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اور لوگوں کو دکھانے کی خاطر، اپنا مال خرچ کرتا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ پتھر کی کسی چٹان پر ذرا سی مٹی پڑی ہو۔ اس پر زور کی بارش پڑے، اور وہ اس مٹی کو بہا کر لے جائے اور وہ چٹان صاف کی صاف رہ جائے....
>
> اس کے برعکس، وہ لوگ جو مستقل اقدارِ خداوندی کی رو سے اس ایمان کی بنا پر دوسروں کو دیتے ہیں کہ اس سے ان کی اپنی ذات میں ثبات اور استحکام پیدا ہو جائیگا تو اس کی مثال ایسی ہے کہ اونچی سی زمین پر نہایت عمدہ باغ ہو۔ جب وہی بارش برسے گی تو اس سے باغ میں دُگنا پھل آئے گا۔ اور اگر وہاں زور کی بارش نہ بھی ہو بلکہ یونہی پھوار سی پڑے تو بھی اس کی سیرابی کے لئے کافی ہو جائے۔
>
> (۲/۲۶۴-۲۶۵) نیز (۳/۱۱۶)

اس کے بعد قرآن بتاتا ہے کہ جس معاشی نظام کی بنیاد، خدا اور آخرت کے ایمان پر ہو گی، اس کے نتائج، تمہاری آئندہ نسلوں تک کو بھی متمتع کرتے رہیں گے۔ یہی وہ اساسِ محکم ہے جس سے اس عمارت کو پائیداری نصیب ہو گی۔ غلط نظام میں "نیکیوں کے کام" کچھ وزن نہیں رکھتے، اس لئے کہ ان کا جذبۂ محرکہ محکم نہیں ہوتا۔ سورۂ توبہ میں قریش کو مخاطب کر کے کہا کہ:-

> کیا تم سمجھتے ہو کہ حاجیوں کے لئے پانی کی سبیلیں لگا دینا اور کعبہ کی تزئین و آرائش

کر دینا، اس شخص (کے کاموں) کی مانند ہو جائے گا جو خدا اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور خدا کی راہ میں مصروفِ جدوجہد رہتا ہے۔ (تم اپنے ذہن سے جو چاہے فیصلہ کرلو) میزانِ خداوندی میں یہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ (9/19)

سورۂ بقرہ میں ہے۔

نیکی یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف، نیکی یہ ہے کہ تم خدا، آخرت، ملائکہ، کتب اور انبیاءؑ پر ایمان لانے کے بعد، اپنے مال کو، اس کی کشش و جاذبیت کے باوجود، دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دو...... (2/177)

کفر کا نظریۂ زندگی رکھنے والوں کے متعلق کہا کہ "ان کے اعمال کی مثال یوں سمجھو جیسے راکھ کا ڈھیر ہو اور جھکڑ چلے بہت زور کا۔ وہ اس سے اڑا کر لے جائے گا۔" (14/18) کفر کے نظریہ کے معنی یہ ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ اس لئے ایسے لوگوں کی تمام سعی و عمل کا منتہیٰ اس دنیا کے مفادات ہی ہو سکتے ہیں۔ سورۂ کہف میں ہے۔

کیا میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے زیادہ خسارہ میں رہنے والے لوگ کون ہیں! وہ جن کی ساری کوششیں اس دنیا کے مفاد کے حصول میں کھو گئیں اور اپنے دل میں سمجھتے رہے کہ ہم بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دے رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قوانینِ خداوندی اور حیاتِ آخرت سے انکار کرتے ہیں۔ سو ان کا کیا کرایا سب رائیگاں چلا گیا۔ نتائج برآمد ہونے کے وقت ان کے اعمال کا وزن کرنے کے لئے میزان تک بھی کھڑی نہیں کی جائے گی۔ (18/104---105)

سورۂ محمدؐ میں ہے کہ تم روئے زمین پر چلو پھرو۔ اور پھر دیکھو کہ جن قوموں کا نظریۂ حیات طبیعی زندگی تھا، ان کا انجام کیا ہوا (47/9) ان کے اعمال رائیگاں گئے اور آخرالامر وہ بڑے خسارے میں رہے (65/5)۔ ایمان بالآخرت کی اہمیت کے متعلق راقم الحروف لکھتا ہے۔

انسان کے موجودہ اعمال اس کے مستقبل کو متاثر کرتے ہیں یعنی جس قسم کے اس کے اعمال آج ہوں گے اسی قسم کا اس کا "کل" ہوگا۔ بالفاظِ دیگر، اس کے لئے تسلسلِ حیات پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ جو شخص صرف موجودہ زندگی کا قائل ہے وہ پیش پا افتادہ مفاد کے پیچھے لگا رہے گا۔ اور مستقل اقدار کو کچھ اہمیت نہیں دے گا، کیونکہ مستقل اقدار انسانی سیرت کی تعمیر کرتی ہیں اور سیرت کی تعمیر کی اہمیت اسی صورت میں سمجھ میں آسکتی ہے جب انسان زندگی کو مستقل اور مسلسل سمجھے۔ جو یہ سمجھے کہ میری سانس کے ساتھ میری سیرت کا خاتمہ ہو جائے گا اسے تعمیرِ سیرت کے لئے سر کھپانے کی ضرورت کیا ہے؟

ملہ قرآنِ مجید میں اس مضمون کی اور بھی بہت سی آیات ہیں۔ مثلاً (2/212) (21/3) (142/7) (9/69)۔

یہ ہے ایمان کا تعلق اعمال کے ساتھ۔ اسے پھر سمجھ لیجئے کہ ایمان (نظریۂ حیات) ہی عمل کے لئے جذبۂ محرکہ بنتا ہے۔ اس لئے اعمال کو ایمان سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ جو جذبہ بھی آپ کے عمل کا محرک ہوگا، وہ آپ کا "ایمان" کہلائے گا۔ ہم اس وقت بات کی وضاحت کے لئے اس اصطلاح کو وسیع معنوں میں استعمال کر رہے ہیں۔ ورنہ قرآن نے صحیح نظریۂ زندگی کو ایمان اور غلط نظریہ کو کفر ——— یعنی صحیح نظریہ سے انکار ——— کہہ کر پکارا ہے۔ اگر آپ "ایمان" کی جگہ نظریۂ زندگی کہہ لیں، تو پھر یوں کہا جائے گا کہ نظریۂ زندگی ان مقاصد کا تعین کرتا ہے جن کے حصول کے لئے انسان کوشش کرتا ہے۔ یوں ایمان، عمل کی بنیاد قرار پاجاتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے متعلق ایکال نے کہا ہے کہ

> انسانی ذہن اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز پر ایمان رکھے۔ ۔ ۔ جب اسے ایمان کے لئے کام کی باتیں نہیں ملتیں تو وہ بیکار اور خراب مقاصد پر ریجھ جاتا ہے۔ خلا، قدرت کے کارخانے میں محال ہے اور محض مادی دنیا میں نہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی دنیا میں بھی خلا ناممکن ہے۔ انسان جب خدا پر ایمان چھوڑ دے تو شیطان کی پرستش کرنے لگ جاتا ہے۔ اور اچھے نصب العینوں سے دستکش ہو جائے تو برے راستے اسے اچھے لگنے لگ جاتے ہیں۔ یورپ کو اگر اس دلدل سے نکلنا ہے تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ بے یقینی کی جگہ یقین اور ایمان لے لے۔ یہ مادیت ختم ہو اور یورپ والے نئی قدروں پر ایمان اور نئے اخلاقی ضابطوں سے محبت پیدا کریں۔ وہ زندگی جس میں نہ ایمان کی حرارت ہو اور نہ اخلاقی ضابطہ کی کشش، وہ زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے۔

"ایمان" درحقیقت انسان کے لئے مقاصد کا تعین کرتا ہے۔ وہ اس سوال کا جواب دیتا ہے کہ "میں ایسا کیوں کروں؟" اور جو شخص مستقل اقدارِ حیات (خدا، وحی، رسالت) اور انسانی ذات (مکافاتِ عمل اور حیاتِ آخرت) پر ایمان نہیں رکھتا وہ اس سوال کا اطمینان بخش جواب دے نہیں سکتا کہ وہ دوسروں کی خاطر اپنی جان کیوں مارے؟ اگر اس کا جواب کسی دنیاوی فائدے کا حصول نہیں تو جذباتی ہوگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جذبات کسی نظامِ عمل کے لئے محکم اور پائیدار اساس بن نہیں سکتے۔ اساسِ محکم تو صحیح نظریۂ حیات کی صداقت پر یقینِ محکم ہی بن سکتا ہے۔ یلعی نظریۂ حیات نے اسی اساسِ محکم کو گم کر دیا ہے جس کی وجہ سے، افراد اور اقوام، دونوں کی زندگی جہنم کی سی ہو رہی ہے۔ عصرِ حاضر کے ممتاز ماہرِ نفسیات ڈاکٹر ینگ نے اپنی مشہور کتاب (MODERN MAN IN SEARCH OF SOUL) میں لکھا ہے کہ

> میں نے اپنی زندگی کے نصف آخر میں جس قدر مریضوں کا تجزیۂ نفس کیا، ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جس میں زندگی کے مسائل کے لئے مذہبی زاویۂ نگاہ کی کمی نہ ہو۔ ان میں سے ہر ایک کی بیماری کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اس "شے" کو ضائع کر دیا تھا جو زندہ مذہب انسانوں کو مہیا کرتا ہے۔ ان کا علاج اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہیں پھر سے وہی "شے" دے دی جائے جو ان سے گم ہو چکی تھی یہی ان کی دوا تھی ——— عقیدہ، امید، محبت، نگاہِ خود بیں۔ (P. ۲۶۴)

---

(۱) صحیح نظریۂ زندگی قرآن مجید ہی سے مل سکتا ہے اسے ہم علیٰ وجہ البصیرت ثابت کر سکتے ہیں لیکن اس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں۔

اور یہی "شے" ہمارے ہاں بھی مفقود ہے۔ ہماری دشواری ایک اور بھی ہے۔ ہم جب اپنے آپ کو مسلمان اور دوسروں کو غیر مسلم (کافر) کہتے ہیں تو اس سے کچھ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم صاحبِ ایمان ہیں اور غیر مسلم کو ایمان نصیب نہیں ـــــ اس بنیادی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کے بعد، جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہم اخلاقی حیثیت سے کس قدر پست ہیں اور بعض، غیر مسلم بڑے اچھے اچھے کام کرتے ہیں، تو ہمارے دل میں لامحالہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ایمان کا اعمال کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اگر ایمان اور اعمال کا تعلق لاینفک ہوتا، تو ہم (مسلمان۔ یعنی صاحبِ ایمان) اچھے کام کرتے اور غیر مسلم اخلاقی اعتبار سے پست سطح پر ہوتے۔ اس خیال کی وجہ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، وہ غلط فہمی ہے جس کی رُو سے ہم نے اپنے آپ کو صاحبِ ایمان سمجھ رکھا ہے۔ (جیسا کہ شروع میں بتایا جا چکا ہے) ایمان ایک نظریۂ حیات کو علیٰ وجہ البصیرت قبول اور اختیار کرنے کا نام ہے۔ یہ قلب و دماغ کا ایک مثبت عمل ہے جس سے انسان میں ایک خاص قسم کی نفسیاتی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ یہی نظریہ انسانی زندگی کے لئے مقاصد کا تعین کرتا ہے اور ان مقاصد کے حصول کے لئے جد و جہد کو "نیک کام" کہا جاتا ہے۔ اس نظریۂ زندگی (ایمان) اور اس کی بنیادوں پر اٹھی ہوئی نیک اعمال (اعمالِ صالح) کی عمارت کا نام "الاسلام" ہے۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ

(۱) اسلامی مملکت اسے کہیں گے جس کا تمام کاروبار (کوئی ایک گوشہ نہیں بلکہ تمام کاروبار) وحی (قرآن) کی عطا کردہ مستقل اقدار کے تابع سرانجام پائے۔ اس قسم کی مملکت کے نظام کو اسلامی نظام کہا جائے گا۔

(۲) یہ ہو نہیں سکتا کہ مملکت کا کوئی ایک گوشہ (سیاسی، معاشرتی، معاشی) تو اسلامی ہو، اور باقی شعبے غیر اسلامی ہوں یا باقی تمام شعبے اسلامی ہوں اور کوئی ایک شعبہ غیر اسلامی ہو۔ اگر مملکت کا کوئی ایک گوشہ بھی غیر اسلامی ہوگا تو وہ مملکت اسلامی نہیں کہلا سکے گی۔ اسلامی مملکت کا ہر گوشہ اسلامی ہوتا ہے۔ جنت کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہو سکتا جسے جہنم کہا جا سکے۔ نہ ہی جہنم کا کوئی ایک گوشہ، جنت قرار پا سکتا ہے۔ جس طرح انسان کا کوئی حصہ مومن اور کوئی حصہ کافر نہیں ہوتا اسی طرح مملکت کا ایک گوشہ اسلامی اور دوسرا گوشہ غیر اسلامی نہیں ہو سکتا۔

(۳) اس قسم کی (اسلامی) مملکت ان لوگوں کے ہاتھوں قیام پذیر ہوتی ہے جو خدا، وحی، رسالت (مستقل اقدارِ حیات)، انسانی ذات، قانونِ مکافاتِ عمل، اور تسلسلِ حیات (مرنے کے بعد کی زندگی) پر علیٰ وجہ البصیرت یقین رکھیں۔ اور ان کے اس یقین (ایمان) کا مظاہرہ ان کے اعمالِ حیات، ان کی سیرت و کردار، ان کے روزمرہ کے کاموں سے ہو۔ انہی افراد کی ہیئتِ اجتماعیہ کو ملتِ اسلامیہ، امتِ مسلمہ، جماعتِ مومنین، کہا جاتا ہے ـــــ مملکت، قرار دادِ مقاصد پاس کرنے۔ چند شرعی قوانین نافذ کرنے۔ یا کسی خاص ٹائپ کی حکومت قائم کرنے یا کوئی خاص معاشی پروگرام اختیار کرنے سے اسلامی نہیں بن جاتی ـــــ نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر! مملکت، افرادِ مملکت کے قلب و نگاہ میں تبدیلی سے اسلامی بن سکتی ہے اور قلب و نگاہ کی تبدیلی صحیح تعلیم و تربیت کے بغیر ممکن نہیں۔

لہٰذا ہمارے موجودہ معاشرہ میں جس میں قلب و نگاہ کی تبدیلی پیدا ہی نہیں ہوتی، اسلامی مملکت قائم نہیں ہو سکتی۔ اسے مسلمانوں کی مملکت کہنا چاہیئے نہ کہ اسلامی مملکت۔

یہ ہوتی ہے تھیاکریسی

ہم سے اکثر کہا جاتا ہے کہ آپ "تھیاکریسی" کی اصطلاح تو عام طور پر استعمال کرتے ہیں لیکن کسی مثال سے متعین طور پر بتایا نہیں کہ تھیاکریسی ہوتی کیا ہے؟ سن لیجئے۔

پچھلے دنوں فلمی دنیا کے نمائندوں کی ایک تقریب صدرِ مملکت کے ساتھ منعقد ہوئی۔ اسکی روئداد کے سلسلہ میں، روزنامہ جنگ (لاہور) کی ۱۶ جولائی کی اشاعت (صفحہ ۱) میں کہا گیا ہے۔

اجلاس میں مسعود پرویز نے فلم میسیج (MESSAGE) کا ذکر کیا۔ ... اور کہا کہ اس فلم کے ذریعے اسلام کی تبلیغ ہوئی ہے اور افریقہ میں بے شمار لوگ یہ فلم دیکھ کر مسلمان ہوئے ہیں۔ یہ فلم پاکستان میں کیوں نہیں دکھائی جاتی؟

صدر مملکت نے مسعود پرویز کے خیالات سے اتفاق کیا اور بتایا کہ انہوں نے بھی یہ فلم دیکھی ہے اور پاکستان کو یہ فلم دکھانا بھی چاہتے ہیں مگر وہ علمائے کرام کو راضی نہیں کر سکے۔ انہوں نے بتایا کہ اردن کے علمائے کرام نے بھی اس فلم کی نمائش کی اجازت دیدی تھی اور دیگر بہت سے مسلمان ملکوں میں بھی یہ فلم دکھائی جا چکی ہے لیکن پاکستان کے علماء کرام اس کی اجازت نہیں دیتے لہٰذا ہم مجبور ہیں۔

لیجئے

(۱) سربراہ مملکت نے ایک فلم دیکھی ہے جس سے ان کے اندازے کے مطابق اسلام کی تبلیغ ہو سکتی ہے۔

(۲) وہ اس مقصد کے لئے اسے پاکستان میں دکھانا چاہتے ہیں۔

(۳) لیکن یہاں کے علماء کرام اس کی اجازت نہیں دیتے۔

(۴) لہٰذا وہ مجبور ہیں۔

کون مجبور ہے؟ سربراہ مملکت مجبور ہے۔ صدرِ پاکستان مجبور ہے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مجبور ہے۔ یعنی حکومتِ پاکستان مجبور ہے کیوں مجبور ہے؟ اس لئے کہ علماء کرام اجازت نہیں دیتے۔

اسے کہتے ہیں تھیاکریسی جس میں حکم مذہبی پیشوائیت کا چلتا ہے۔ حکومت ان کے فیصلوں کے نافذ کرنے کا فقط ذریعہ ہوتی ہے۔ اسی طرزِ حکومت کو ختم کرانے کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا کیونکہ یہ طرزِ حکومت نہ اسلام کو باقی چھوڑتا ہے نہ مملکت کو۔

ممکن ہے اب یہ مسئلہ علماء کرام کے زیرِ غور ہو کہ صدرِ پاکستان ایک ایسی فلم دیکھ چکے ہیں جس کا دیکھنا ان کے نزدیک جائز نہیں، اس لئے انہیں اس گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہیئے!

حقائق و عبر

۱۔ بھلا ہوا میری مالا ٹوٹی، میں رام جپنے سے چھوٹی۔

روزنامہ جنگ (لاہور) کا ایک مستقل کالم ہے جس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ہماری صحافت کی موجودہ گرد آلود بلکہ متعفن فضا میں اس کا وجود مغتنمات میں سے ہے۔ اسلوبِ بیان سنجیدہ اور پُر وقار، اور خیالات بھی فی الجملہ گوارا۔ کالم نگار ہیں محترم ارشاد احمد حقانی۔ وہ (بالعموم) کالم خود لکھتے ہیں، لیکن کبھی کبھی اس میں اپنے قارئین کے خطوط بھی شائع کر دیتے ہیں۔ یہ ہمارے لئے ایک گونہ باعثِ اطمینان ہوتے ہیں۔ طلوعِ اسلام کے خیالات اور قرآنی نظریات کے لئے ہمارے ذرائع ابلاغ کے دروازے بند ہیں۔ مذکورہ بالا مراسلات نگاروں میں سے بعض، طلوعِ اسلام کے صفحوں کے صفحے نقل کر کے اپنے نام سے بھیج دیتے ہیں اور اس طرح ہمارے خیالات کی اشاعت ہو جاتی ہے۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں، اس لئے کہ ہمارا مقصد قرآنی فکر کی نشر و اشاعت ہے، وہ کسی نام سے ہو جائے — غرض از میان سلامتِ او ست۔

اس اخبار کی ۳ جولائی ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں (مذکورہ صدر کالم میں) ایبٹ آباد کے جناب ارشد محمود صاحب کا ایک خط چھپا ہے جس کے لئے وہ (ہمارے نزدیک) تمام ملتِ اسلامیہ کے "شکریہ" کے مستحق ہیں۔ وہ اس میں تحریر فرماتے ہیں:۔

اسلام کے حوالے سے "درجنوں متضاد اور مختلف آراء آپکو مل جائیں گی یہ مختلف آراء دینے والے بھی غلط نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ہر انسان اپنے علمی، مادی، ثقافتی، تہذیبی اور طبقاتی پس منظر میں مذہب کو بیان کرتا ہے۔ جس قسم کی آنکھ ویسا ہی تصوّر۔ حکمرانوں کا نظریۂ اسلام، عوام کے تصوّر سے۔ دیہاتی کا شہری سے۔ پڑھے لکھے کا ان پڑھ سے۔ عورت کا مرد سے۔ سرمایہ دار کا مزدور سے۔ گھریلو عورت کا ملازمت پیشہ عورت سے۔ مولوی کا سائنس دان سے مختلف ہوگا۔ ایسے ہی یہ مختلف طبقات جب تنظیمی شکل اختیار کرتے ہیں تو مودودی صاحب کا اسلام سرمایہ داری نظام میں فٹ ہو جاتا ہے اور شاہوں اور شیخوں کے درباروں سے نوازا جاتا ہے۔ یہی نظریۂ اسلام، پرویزی فکر میں ڈھل کر، اشتراکیت کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ اور یہی اسلام تبلیغی جماعت کی شکل میں ایک خاص قسم کی ذہنیت اور قدامت پرستی کی تصویر بن جاتا ہے۔

سوال پیدا ہوا کہ ان حالات میں کیا کیا جائے؟ فرمایا:

اس لیے بہتر صورت یہ ہے کہ مذہب کو ایک نجی معاملہ رہنے دیا جائے جو اس کا جائز مقام ہے۔

چلئے صاحب۔ قصہ کوتہ گشت ورنہ دردِ سر بسیار بود۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ آپ نے غور فرمایا کہ ان صاحب نے کس طرح امت کے سر سے اُس بوجھ کو اتار پھینکا ہے جس کے نیچے وہ بُری طرح دب رہی تھی! یہ ہے جس کے لیے ہم نے کہا تھا کہ یہ صاحب ملت کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

اس کے بعد یہ صاحب حقانی صاحب اور ان کے معاصرین کو مشورہ دیتے ہیں :۔

آپ جیسے دانشوروں کو نفاذِ اسلام اور تشریحِ اسلام کی بحث سے نکل کر صاف صاف بات کرنی چاہیئے اور بتانا چاہیئے کہ ہمارے مسائل کیا ہیں۔ ان کے اسباب کیا ہیں، اور ان مسائل کو قائم اور دائم رکھنے والے کون ہیں۔

اور اس کے بعد نہ صرف مسلمانوں سے شکریہ کے متقاضی ہیں، بلکہ خود اسلام کو بھی اپنا رہینِ منت قرار دیتے ہیں جو فرماتے ہیں کہ۔

اس طرح کا تجزیہ اسلام کی اصل خدمت ہوگی۔

یعنی اُس اسلام کی جس کے متعلق آپ ارشاد فرما چکے ہیں کہ۔

اَیں دفترِ بے معنی غرقِ مئے ناب اولٰے

ہمیں مراسلہ نگار سے تو گلہ نہیں۔ "کز اہلِ بازار است" (غالب کے الفاظ میں۔ زنگلفروشِ ننالم کز اہلِ بازار است) حقانی صاحب سے گلہ ضرور ہے کہ انھوں نے ایسے اہم سوال کو (جس کا تعلق کفر و اسلام سے ہے) بلا تبصرہ شائع کر دیا۔ کیا ان کے نزدیک بھی، اس امر کے متعین کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ حقیقی اسلام کیا ہے؟ اگر صورت یہی ہے تو (معاف بفرمائید) ختمِ نبوت کے بعد، قرآن کو ابدی طور پر محفوظ رکھنا، معاذ اللہ فعلِ عبث قرار پائیگا۔ اُس ابدی راہنمائی کا فائدہ کیا جو نفسِ اسلام کے متعلق بھی اختلافات نہیں مٹا سکتی؛ قرآن اس مسئلہ کو حل نہیں کر سکتا۔ نبی کوئی آ نہیں سکتا۔ اس کے بعد کشاد کی راہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ اسلام کو مساجد کے حجروں میں محبوس کر دیا جائے۔

آپ نے غور فرمایا کہ ہماری مذہبی پیشوائیت کا مسلک کس طرح مسلمانوں کو مار مار کر اُس اسلام کی طرف لا رہا ہے جسے یہ حضرات (نیشنلسٹ علماء) تحریکِ پاکستان کے دوران پیش کیا کرتے تھے؛ یعنی سیکولرازم کی طرف۔ قرآن کو چھوڑ دینے اور جھگڑا دینے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر قرآنِ خالص کو اتھارٹی تسلیم کر لیا جائے تو کوئی اختلاف پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے، اپنے مِن جانب اللہ ہونے کی ایک بنیادی دلیل یہ دی ہے کہ اس میں تضاد نہیں۔ اختلاف نہیں۔ (۴/۸۲)۔ اختلاف پیدا ہو جانے کی صورت میں اس کے حل کرنے کا طریقہ یہ بتایا ہے

کہ اس کا فیصلہ قرآن سے کراؤ؛ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ...... (۴۲/۱۰) قرآن میں آج بھی اس کی صلاحیت موجود ہے کہ وہ ہمارے اختلافات مٹا دے، شرط یہ ہے کہ اس کے ساتھ کچھ اور نہ ملایا جائے۔ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا۔ (۱۸/۲۶) جہاں اختلاف پیدا ہو، سمجھ لیجئے کہ قرآن چھوڑ دیا گیا ہے، یا اس کے ساتھ کچھ اور ملا دیا گیا ہے۔ لیکن یہ بات غالباً مراسلہ نگار صاحب کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہوگی۔ کیونکہ وہ اسلام کو ایک نجی معاملہ سمجھتے ہیں۔

---

(۲) کسی کو صرف مسلمان رہنے نہیں دیا جائیگا!

ذیل کی خبر کو ہم دل پر پتھر رکھ کر شائع کر رہے ہیں:-

> سندھ ہائی کورٹ کے قائم مقام چیف جسٹس عبدالحی قریشی نے حکم دیا ہے کہ محترمہ فاطمہ جناح کے خاندان کی ایک شاخ کی طرف سے اثنا عشری فقہ کے قانونِ وراثت کے تحت ان کی نصف جائیداد کی ملکیت کے دعوے سے متعلق اپیل کی سماعت رواں سال کے دوسرے نصف میں سندھ ہائی کورٹ کرے گی۔ یہ اپیل والی خاندان نے جسٹس ظفر حسین کے فیصلے کے خلاف دائر کی ہے، جس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ گواہوں سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ قائد اعظم اور محترمہ فاطمہ جناح دونوں مستقلاً کہتے رہے ہیں کہ وہ نہ شیعہ ہیں، نہ سنی۔ بلکہ وہ صرف مسلمان ہیں۔ سندھ ہائی کورٹ گواہوں اور ریکارڈ پر موجود دستاویزات کا دوبارہ جائزہ لے گی اور قائدِ اعظمؒ اور محترمہ فاطمہ جناح کے عقیدے سے متعلق فیصلہ کرے گی۔

فقہی قانون سے یہ گل کھلاتے ہیں! اگر قرآن کا قانونِ وراثت نافذالعمل رہتا تو اس قسم کے تنازعات پیدا ہی نہیں ہو سکتے تھے۔ چونکہ مقدمہ عدالت کے زیرِ غور ہے، اس لئے ہم نفسِ موضوع پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔

---

(۳) ان کا ایڈریس مطلوب ہے۔

معاصر (انگریزی) ڈان کی ۲۲ جون ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں محترم محسن علی صاحب کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:-

> حکومتِ پاکستان کا دعویٰ ہے کہ پینتیس سال کی ہچکولوں کی زندگی کے بعد، آج اس کا شمار دنیا کی غریب ترین مملکتوں میں نہیں ہوتا۔ سرکاری اعداد و شمار کی رُو سے ۱۹۸۳ء میں پاکستان کے ہر گھرانے کی اوسط آمدنی 2580/- روپے ماہانہ تھی۔ (ذرا پھر سُن لیجئے۔ مبلغ اڑھائی ہزار پچیس روپے ماہانہ!) دنیا کی آدھی آبادی ان سے غریب تر حالت میں تھی۔

خبر میں ان گھرانوں کا ایڈریس نہیں بتایا جن کی ماہانہ آمدنی -/2530 روپیہ تھی! ہمارے گرد و پیش جو گھرانے بستے ہیں، ان بیچاروں نے تو کبھی خواب میں بھی اڑھائی ہزار روپیہ نہیں دیکھا ہوگا۔
آپ کو معلوم ہے " اوسط آمدنی فی کس " نکالی کس طرح جاتی ہے؟ ایک شخص کی آمدنی ایک لاکھ دوسرے کی آمدنی دو سو۔ دونوں کی آمدنی ایک لاکھ دو سو۔ ان کی اوسط آمدنی ہوگی پچاس ہزار ایک سو روپیہ۔ اور درحقیقت لاکھ والے کے پاس لاکھ روپیہ ہوگا اور دو سو والے کے پاس دو ہی سو۔ اس حساب سے پاکستان کے ہر گھرانے کی ماہانہ آمدنی -/2530 روپے نکالی گئی ہے۔ اعداد و شمار کا "بجربٹو" اس طرح دولت کے انبار لگایا کرتا ہے!

---

(۴) انہیں کچل ڈالو!

آج کل یہاں ایک اشتہار تقسیم ہو رہا ہے جس کا عنوان ہے:۔
فحاشی۔ عریانی دور کرو۔ عائلی قوانین منسوخ کرو۔
اس میں پہلے ایک حدیث درج ہے:
دنیا میٹھی۔ مزے کی۔ سبز رنگ کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس میں خلیفہ بنا کر دیکھ رہا ہے کہ تم کیسے اعمال کرتے ہو۔ دنیا سے ہوشیار رہو اور عورتوں سے ہوشیار رہو بنی اسرائیل میں سب سے پہلا فتنہ[۱] عورتوں ہی کا آیا تھا۔ (مسلم)
پھر قرآن کی ایک آیت کا (محرف) ترجمہ درج ہے:
اور مردوں کو ان عورتوں پر ایک گونہ فضیلت حاصل ہے[۲] اور اللہ بڑا زبردست ہے۔ بڑا حکمت والا ہے۔ (سورہ بقرہ ۲۲۸۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی)
اس کے نیچے ہے:
اسلامی نظریاتی کونسل کے فتوی مورخہ ۳ ستمبر ۱۹۸۱ء پر عملدرآمد کرتے ہوئے موجودہ سیکولر اور غیر اسلامی عائلی قوانین کو منسوخ کیا جائے "تاکہ ہمارا اسلامی معاشرہ مزید نہ بگڑنے پائے۔"
کچل ڈالو حوا کی ان بیٹیوں کو! ان کا یہ جرم کچھ کم سنگین نہیں کہ انھوں نے آپ کو جنم دیا ہے

---

[۱] یہی وہ "فتنہ گر" ہے جس کے پاؤں کے نیچے جنت بتائی جاتی ہے۔ خود فتنہ اور پاؤں کے نیچے جنت!!
[۲] آیت ہے: وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ۔ مردوں کو ایک بات میں عورتوں پر فوقیت حاصل ہے، اور وہ ایک بات یہ ہے کہ عورتوں پر عدت کی پابندی ہے، اور مردوں پر نہیں۔

سنہ ۱۹۴۰ء کا ریزولیوشن

(ایک ریاست یا متعدد ریاستیں)

ہماری قوم انتہائی خوش قسمت تھی کہ اسے ایک قطرۂ خون بہائے بغیر، اتنی عظیم مملکت مل گئی۔ اور انتہائی بدقسمت ہے کہ اسے، اس مملکت کے یوم پیدائش سے لے کر اس وقت تک، ایک دن بھی چین کا نصیب نہ ہوا۔ یہ مسلسل خطرات کا شکار اور پریشانیوں میں مبتلا رہی۔ یہ خطرات بیرونی بھی تھے اور اندرونی بھی اندرونی خطرات بیرونی سے مہیب تر تھے (اور اس وقت تک ہیں)۔ ان خطرات کے موجب وہ لوگ ہیں جنہوں نے مطالبہ پاکستان کی مخالفت کی تھی اور وہ اب بھی اسے دل سے تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن ان کی مخالفت کی ٹیکنیک بڑی مغالطہ آفریں، دام ہمرنگِ زمین ہوتی ہے۔ وہ کھلے بندوں یہ نہیں کہتے کہ ہم ایسا چاہتے ہیں۔ وہ کہیں گے کہ تشکیل پاکستان کا مقصد یہ تھا۔ قائد اعظمؒ اسے سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے۔ وہ اشتراک وطن (جغرافیائی حدود) کی بناء پر ایک قوم کے قائل تھے۔ اسی قسم کا ایک اور دعویٰ تھا جو انتہائی زہر آلود تھا اور جس کی ہلاکت خیزی، پاکستان کو دولخت کر دینے پر منتج ہوئی۔ شیخ مجیب الرحمٰن (مرحوم) شروع ہی سے پاکستان کے خلاف تھا لیکن وہ برملا اس کا اعلان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ۱۹۶۶ء میں، اس زمانے کے حزب اختلاف کی ایک نیشنل کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کی مجلس مضامین (سبجیکٹ کمیٹی) میں اس نے ایک تجویز پیش کی تھی جس میں کہا تھا کہ

> ملک کا آئینی ڈھانچہ تبدیل کر کے ایسے وفاق کی بنیاد رکھی جائے جو مشرقی اور مغربی پاکستان کی دو خود مختار ریاستوں پر مشتمل ہو۔ مرکزی حکومت صرف دفاع اور امور خارجہ سے متعلق ہو۔ باقی تمام معاملات میں دونوں ریاستیں کاملاً خود مختار ہوں۔

(کوہستان، ۱۰ فروری ۱۹۶۶ء بحوالہ طلوعِ اسلام مارچ ۱۹۶۶ء ص ۳)

اس کے حق میں دلیل یہ دی گئی تھی کہ لاہور ریزولیوشن (۱۹۴۰ء) میں (STATE) نہیں کہا گیا۔ (STATES) کہا گیا تھا۔

اس چنگاری نے جو آگ سلگائی وہ آتشِ خاموش کی طرح اندر ہی اندر آگے بڑھتی گئی تا آنکہ وہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں شعلہ بار ہوئی۔ ہم نے اسی زمانے میں اس موضوع پر بکثرت لکھا اور دلائل و براہین کی رُو سے ثابت کیا تھا کہ ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن کا یہ مفہوم لینا مملکت پاکستان کے بنیادی تصور کے خلاف ہے۔ اس مفہوم کی رُو سے اگر آج مملکت پاکستان کا ایک صوبہ اپنی خود مختاری کا دعویٰ کرتا ہے تو کل کو (مغربی پاکستان کے) باقی صوبے بھی اسی مطالبہ کو لے کر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ مشرقی پاکستان بہرحال علیحدہ ہوگیا اور جس خطرہ کا ہم نے اس وقت احساس دلایا تھا وہ سلگتا ہوا آگے بڑھتا گیا، تا آنکہ اب مختلف گوشوں سے صوبائی خود مختاری کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوگئی ہیں۔ اور ان کی بنیاد ۱۹۴۰ء کے ریزولیشن کو قرار دیا جا رہا ہے۔

۱۹۴۰ء کا ریزولیوشن

پہلے ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن کو لیجئے، بات یوں ہوئی کہ ہندو اور انگریز چاہتا تھا کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت پورے ہندوستان کو ایک مملکت اور وہاں کے باشندوں کو ایک قوم فرض (یا تسلیم) کر کے، ہندوستان کے لئے ایک آئین مرتب کیا جائے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ انگریز اور ہندو پر واضح کیا جائے کہ ان کا یہ منصوبہ، مسلمانوں کے مطالبہ کے یکسر خلاف ہے اور اس قسم کا کوئی آئین ان کے (مسلمانوں کے) نزدیک قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ اس مقصد کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں، ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو وہ ریزولیوشن پاس ہوا جسے بعد میں قراردادِ پاکستان یا لاہور ریزولیوشن کہہ کر پکارا گیا۔ اس ریزولیوشن میں کہا یہ گیا تھا کہ

> مسلمانوں کے نزدیک کوئی آئینی پلان قابلِ قبول نہ ہوگا تاوقتیکہ وہ ان اصولوں کے مطابق مرتب نہ کیا جائے کہ جغرافیائی اعتبار سے ملحق علاقوں کی نشاندہی کر کے انہیں اس طرح کے خطے بنا دیا جائے کہ جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں مثلاً ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق کے خطے، انہیں باہمد گر ملا کر آزاد مملکتیں بنا دیا جائے۔

ظاہر ہے کہ اس ریزولیوشن میں، نہ ایک مملکت کا ذکر ہے نہ دو کا۔ اس میں صرف یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے انہیں ہندوستان کا حصہ قرار نہ دیا جائے۔ انہیں ہندوستان سے الگ، آزاد قرار دیا جائے۔ اور اس اعتبار سے نیا کانسٹی ٹیوشن مرتب کیا جائے۔ اس میں شمال مغرب اور شمال مشرق کو شمال کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس سے، قائداعظمؒ یا مسلم لیگ کی مراد، شمال مغرب اور شمال مشرق میں دو الگ الگ آزاد مملکتیں تھیں یا ان دونوں کو ملا کر ایک مملکت۔ حقیقت

قائداعظمؒ کا تصوّر

یہ ہے کہ سنہ ۱۹۴۰ء سے لے کر ان کی وفات تک، قائداعظمؒ کی کسی تقریر، تحریر یا بیان میں دو مملکتوں کا اشارہ تک بھی نہیں ملتا۔ اس کے برعکس، انہوں نے اُسی زمانے میں اس کی وضاحت کر دی تھی۔ اور وہ اسے تقسیم ہند تک برابر دہراتے رہے کہ اس سے مراد، ایک مملکت ہے۔ لاہور ریزولیوشن سنہ ۱۹۴۰ء میں پاس ہوا۔ اس کے ایک سال بعد، مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس مدراس

سنہ ۱۹۴۱ء میں فرمایا

میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کے خطبۂ صدارت میں قائداعظمؒ نے فرمایا۔ ہم نے اس امر کا تہیہ کر رکھا ہے۔ اور اس باب میں کسی کو کسی قسم کا شک و شبہ نہ رہے کہ ہم نے یہ تہیہ کر رکھا ہے کہ ہم اپنے آپ کو ایک آزاد قوم کی حیثیت سے منوا کر رہیں گے۔ اور اس برصغیر میں ایک آزاد مملکت قائم کر کے چھوڑیں گے۔ (تقاریر جناح، شائع کردہ محمد اشرف، جلد اوّل صفحہ ۲۸۰)

یہ سنہ ۱۹۴۱ء کی بات ہے۔ اب آگے چلیے۔ ۱۹۴۴ء میں، مسٹر گاندھی اور قائداعظمؒ

گاندھی۔جناح خط و کتابت

کے مابین وہ خط و کتابت ہوئی جس نے مسلم لیگ کے مؤقف اور مطالبہ کو نکھار اور ابھار کر رکھ دیا خط و کتابت میں زیر بحث بنیادی سوال یہی تھا کہ

۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن کا مفہوم کیا ہے؟

ظاہر ہے کہ اس ریزولیشن کا جو مفہوم اس خط و کتابت میں پیش کیا گیا تھا اس سے زیادہ مستند مفہوم اور کون سا ہو سکتا ہے؟ یہ خط و کتابت ستمبر ۱۹۴۴ء میں ہوئی تھی اور اسے نومبر سنہ ۱۹۴۴ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سنٹرل آفس نے نواب زادہ لیاقت علی خان (مرحوم) کے پیش لفظ کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس وقت ہمارے سامنے وہی نسخہ ہے۔ یہ خط و کتابت اس قابل ہے کہ اسے بہ تمام و کمال سامنے لایا جائے لیکن ہم اس وقت صرف مسٹر گاندھی کا وہ متعین سوال جس کا تعلق ہمارے مسئلہ زیر نظر سے ہے، اور قائداعظمؒ کا جواب درج کرتے ہیں۔

مسٹر گاندھی:۔ کیا یہ دو خطّے الگ الگ آزاد مملکتیں ہوں گی؟

قائداعظمؒ:۔ نہیں! یہ مملکت پاکستان کے اجزاء (UNITS) ہوں گے

ہم سمجھتے ہیں کہ قائداعظمؒ کے اس جواب کے بعد، اس مسئلہ کے متعلق کچھ اور کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن قارئین کی دلچسپی کے لئے ہم قائداعظمؒ کی پیش کردہ دو ایک اور وضاحتیں بھی سامنے لاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک خط میں کہا تھا کہ ملک کی تقسیم کے بعد، متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ

(۱) ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کے مابین ہوگا۔

(۲) ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے، اس میں دو آزاد مملکتیں قائم کر دی جائیں۔ ایک ہندوستان دوسرا پاکستان

مسٹر گاندھی نے پوچھا تھا کہ تقسیم کے بعد بھی دفاع اور اسی قسم کے دیگر معاملات لیسے رہ جائیں گے جن کا تعلق ہندوستان اور پاکستان سے مشترکہ طور پر ہوگا۔ ان کا تصفیہ کیسے ہوگا۔ قائداعظمؒ کا جواب تھا۔

جب ہندوستان اور پاکستان دو الگ الگ آزاد مملکتیں ہوں گی تو ان میں کسی مشترکہ معاملہ کا سوال کیسے پیدا ہوگا؟

جب یہ مذاکرات ناکام رہ کر ٹوٹے ہیں تو مسٹر گاندھی نے قائداعظمؒ سے کہا تھا کہ آپ مجھے خواہ مخواہ مطعون کرتے ہیں کہ میں نے آپ کا کوئی مطالبہ نہیں مانا۔ آپ ذرا وضاحت تو کیجئے کہ میں نے آپ کا کون سا مطالبہ نہیں مانا؟ اس کے جواب میں قائداعظمؒ نے جن مطالبات کی وضاحت کی تھی ان میں بنیادی طور پر کہا گیا تھا کہ:۔

آپ نے (مسٹر گاندھی نے) اسے بھی تسلیم نہیں کیا کہ لاہور ریزولیشن کی رُو سے پاکستان ان دو خطوں پر مشتمل ہوگا جن میں شمال مغرب میں پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد کے صوبے ہوں گے اور شمال مشرق میں بنگال اور آسام کے صوبے

فرمائیے! اس سے زیادہ وضاحت اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد، قائداعظمؒ نے (۱۵ اکتوبر ۱۹۴۴ء کو) ڈیلی ورکر لندن کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا:۔

مطالبہ پاکستان کو پوری وضاحت سے سمجھنے کے لئے اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ چھ صوبے، یعنی سرحد، بلوچستان، سندھ، پنجاب، شمال مغرب میں، اور بنگال اور آسام شمال مشرق میں۔ ان میں مسلمانوں کی آبادی سات کروڑ کے قریب ہے جو کل آبادی کا ستر فیصد ہے۔ باقی غیر مسلم ہیں۔ مسلمان چاہتے ہیں کہ ان صوبوں پر مشتمل پاکستان کو ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے قائم کیا جائے

یہ اکتوبر ۱۹۴۴ء کی بات ہے۔ قائداعظمؒ نے ۸ نومبر ۱۹۴۵ء کو ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا۔

جغرافیائی حیثیت سے، پاکستان مغرب میں صوبہ سرحد، بلوچستان، سندھ اور پنجاب پر مشتمل ہوگا، اور مشرق میں بنگال اور آسام اس کا دوسرا حصّہ ہوں گے۔

(تقاریر جناحؒ۔ جلد دوم۔ ص ۳۲۵)

یہ نومبر ۱۹۴۵ء کی بات ہے۔ اس کے بعد مارچ ۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن، ہندوستان آیا۔ تحریک پاکستان کی تاریخ میں یہ بڑا نازک مرحلہ تھا

۱۹۴۶ء کا کنونشن

اس وقت ضرورت تھی کہ مشن کے سامنے، مسلمانوں کا

مطالبہ، نہایت متعین الفاظ میں پیش کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے قائداعظمؒ نے ایک نہایت مدبرانہ قدم اٹھایا۔ اس وقت انتخابات حال ہی میں ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان انتخابات کے نتیجہ میں جو مسلمان اراکین لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر آئے تھے، وہی مسلمانوں کے صحیح اور مستند نمائندے تھے۔ قائداعظمؒ نے مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے ان تمام اراکین، جن کی تعداد پانچ سو سے زیادہ تھی، پر مشتمل ایک کنونشن (دہلی میں) منعقد کیا۔ اس کنونشن کا اجلاس ۸، ۹ اپریل کو اینگلو عربک کالج کے میدان میں ہوا۔ اس میں (بنگال کے راہنما) مسٹر سہروردی نے، اپنی اس تقریر کے ساتھ، جسے فی الحقیقت ایک ادبی شاہپارہ کہا جا سکتا ہے، وہ ریزولیشن پیش کیا جس میں پاکستان کی واحد آزاد مملکت کا مطالبہ پیش کیا گیا جو شمال مغرب میں، سرحد، پنجاب، سندھ اور بلوچستان۔ اور شمال مشرق میں بنگال اور آسام پر مشتمل ہوگی۔ اس کنونشن نے اس قرارداد کو منظور کیا۔ اگرچہ اس کنونشن کی حیثیت کچھ کم ذمہ دارانہ نہیں تھی لیکن مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری، نوابزادہ لیاقت علی خان (مرحوم) نے وہیں اعلان کر دیا تھا کہ اس قرارداد کی توثیق مسلم لیگ کونسل سے بھی کرا لی جائے گی۔ چنانچہ اس کی توثیق مسلم لیگ کونسل کے اس اجلاس سے کرا لی گئی جو قائداعظمؒ کی صدارت میں ۹ جون ۱۹۴۷ء کو دہلی میں منعقد ہوا۔

اس ریزولیوشن کے پاس ہونے کے بعد، قائداعظمؒ نے کیبنٹ پلان کے سلسلہ میں بیان دیتے ہوئے (۲۳ مئی ۱۹۴۶ء کو) کہا:۔

مسلم لیگ کی پوزیشن یہ ہے کہ مشرق میں بنگال اور آسام اور مغرب میں پنجاب۔ سرحد، سندھ اور بلوچستان مل کر ایک آزاد و خود مختار مملکت قرار پائیں گے

(تقاریر جلد دوم صفحہ ۳۹۰)

اور اسی کے مطابق ملک کی تقسیم ہوئی اور پاکستان کی آزاد مملکت وجود میں آگئی۔

واضح رہے کہ اس کنونشن میں یہ سوال خاص طور پر زیر بحث آیا تھا کہ ۱۹۴۰ء کے ریزولیشن میں ایک مملکت کا تصور دیا گیا تھا یا دو مملکتوں کا۔ اس نکتہ کی شرح وبسط سے تشریح کی گئی تھی۔ اور آخر میں یہی قرار پایا تھا کہ (جیسا کہ قائداعظمؒ اس کی تشریح کرتے چلے آئے ہیں) اس ریزولیوشن میں بھی ایک ہی مملکت کا تصور دیا گیا تھا۔

۱۹۷۲ء کا مقالہ یہ ہے وہ مقالہ جسے ہم نے ۱۹۷۲ء میں شائع کیا تھا۔ ہم سمجھتے ہیں اور آپ ہم سے متفق ہوں گے کہ اس سوال کے متعلق کہ ۱۹۴۰ء کے ریزولیشن کا مفہوم کیا تھا اور قائداعظمؒ اس کا کیا مطلب لیتے تھے، کسی حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں۔ ہم نے ایک مملکت (پاکستان) کا مطالبہ کیا تھا۔ اور ۱۹۴۷ء

ہیں ہمیں ایک مملکت حاصل ہوئی تھی، قائداعظمؒ جس کے پہلے (واحد) گورنر جنرل تھے اور مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے صوبے اس ایک مملکت کے انتظامی خطے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی مملکت کے خلاف بغاوت کا نتیجہ تھی اور اگر مغربی پاکستان کا کوئی صوبہ (خدانخواستہ) اس قسم کا خیال اپنے دل میں رکھتا ہے تو وہ خیال باغیانہ ہے۔ اُسے اسے جرأت کر کے اپنی طرف سے پیش کرنا چاہیئے۔ قائداعظمؒ کے مونڈھے پر رکھ کر بندوق چلانا یا ۱۹۴۰ء کے ریزولیشن کی کمین گاہ میں چھپ کر وار کرنا، بزدلی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس مملکت کو اس قسم کے باغیانہ مکائد سے محفوظ رکھے۔

اسلامی مملکت کے متعلق اہم سوالات

طلوعِ اسلام بابت جون ۱۹۸۴ء میں، اسلامی مملکت سے متعلق چند سوالات اور ان کے جواب (پرویز صاحب کے قلم سے) شائع ہوئے تھے۔ ان میں دو ایک سوالات باقی رہ گئے تھے جنہیں انکی اہمیت کے پیش نظر اب شائع کیا جا رہا ہے۔

سوال:۔ آج کل اس سوال نے بڑی اہمیت اختیار کر رکھی ہے کہ اسلام میں سیاسی پارٹیوں کی اجازت ہے یا نہیں؟ اس کی بابت آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب:۔ میں پہلے اس سوال کی صحیح سمت متعین کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ صدرِ اوّل میں جب "اسلام" کا لفظ بولا جاتا تھا تو ہر شخص سمجھتا تھا کہ اس کا مفہوم کیا ہے اور اس کے لئے اختلاف کیا۔ یہ مفہوم بھی متعین تھا اور اختلافی بھی متفق علیہ (یعنی خدا کی کتاب)۔ اس لئے اس لفظ سے کسی قسم کی الجھن پیدا نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اب کیفیت یہ ہے کہ یہ ہے وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا۔ نہ اس کا کوئی متفق علیہ مفہوم متعین ہے، نہ اختلافی۔ جس کا جی چاہے کہہ دیتا ہے کہ یہ اسلام کی رو سے جائز ہے، یہ ناجائز۔ اسلام یہ کہتا ہے۔ اسلام وہ کہتا ہے۔ اسلامی نظام۔ اسلامی مملکت۔ اسلامی شریعت۔ اسلامی تمدن وغیرہ۔ مثل مشہور ہے کہ "غریب کی جورو سب کی بھابھی"۔ یہی حالت "اسلام" کی ہو رہی ہے۔ پارٹیوں کے سوال ہی کو لیجئے۔ جن کی پارٹیاں ہیں وہ کہتے پھرتے ہیں کہ اسلام میں پارٹیوں کی اجازت ہے۔ جس کی کوئی پارٹی نہیں وہ کہتا ہے کہ اسلام میں پارٹیوں کی اجازت نہیں۔ وہ بھی اسلام۔ یہ بھی اسلام۔ حتیٰ کہ وفاقی شرعی عدالت نے فیصلہ کیا کہ رجم کی سزا غیر اسلامی ہے، اور پھر اسی عدالت نے (جسے از سرِ نو مرتب کیا گیا تھا) نظرِ ثانی کے بعد فیصلہ دیا کہ رجم کو سزا عین مطابق اسلام ہے۔ ایسا کچھ ہر روز ہو رہا ہے۔

اسی الجھن سے بچنے کے لئے میں یہ کہا کرتا ہوں کہ قرآن کی رُو سے صورت یوں ہے۔

یہ فیصلہ قرآنی ہے، یہ غیر قرآنی۔ عملی حیثیت سے میں یہ کہا کرتا ہوں کہ "اسلامی مملکت میں صورت یوں ہوگی"۔ اور اسلامی مملکت وہ ہے جس میں حکمرانی کتاب اللہ کی ہوگی۔ جب میں کہوں کہ اسلامی مملکت میں یوں ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو کچھ میں نے (قرآن کی رُو سے) کہا ہے اس کا اطلاق غیر اسلامی مملکت میں نہیں ہوگا۔

اب آیئے آپ کے سوال کی طرف سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ اسلامی مملکت میں، ضابطہ قوانین خدا کی کتاب ہوگی جس پہ ساری امت کا ایمان ہوگا۔ اس ضابطہ قوانین میں کوئی تضاد نہیں، اختلاف نہیں۔ امت (قوم) کا فریضہ اس ضابطہ قوانین کو عملاً نافذ کرنا ہوگا۔ قرآن نے اس امت کو امتِ واحدہ کہا ہے۔ کوئی امت، امت واحدہ اس وقت قرار پاتی ہے جب وہ ایک ضابطۂ قوانین کے تابع زندگی بسر کرے۔ جب کسی قوم میں ایک سے زیادہ ضوابط قوانین ہوں تو وہ امت واحدہ نہیں رہتی۔ اس میں تفرقہ پیدا ہو جاتا ہے۔ تفرقہ کو قرآن نے شرک قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس میں مختلف فرقے (گروہ۔ پارٹیاں) مختلف ضوابط کے تابع ہوتے ہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ اسلامی مملکت میں مختلف پارٹیوں کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ ہماری دشواری یہ ہے کہ ہم فیصلے کرتے ہیں غیر اسلامی نظام میں رہتے ہوئے، اور جو فیصلہ ہماری مصلحت یا مفاد کے مطابق ہوتا ہے، اسے قرار دے دیتے ہیں اسلامی! اسی طرح فریق ثانی اپنے فیصلے کو اسلامی قرار دے دیتا ہے۔ اسلامی مملکت میں نہ اس قسم کے تضادات و اختلافات پیدا ہوتے ہیں، نہ امت فرقوں اور پارٹیوں میں منقسم ہوتی ہے۔

ایک تماشا اور بھی قابلِ دید ہے۔ بعض مذہبی فرقے، سیاسی پارٹیوں کو خلافِ اسلام قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ ان سے امت میں تفرقہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ سیاسی پارٹیوں کو تو خلاف اسلام قرار دیتے ہیں لیکن مذہبی فرقوں کو خلاف اسلام قرار نہیں دیتے!

سوال:- جو لوگ پارٹیوں کے حق میں ہیں وہ اس کے لئے ایک دلیل یہ بھی دیتے ہیں کہ قائداعظمؒ نے بھی تو ایک پارٹی بنائی تھی؟

جواب:- اس مغالطہ آفرینی کا چھلکا تو ایک جھٹکے سے اتر جاتا ہے۔ اس حقیقت سے اپنے بیگانے، دوست، دشمن کسی کو بھی انکار نہیں کہ قائداعظمؒ کے دعوے کا مدار ——— دو قومی نظریہ پہ تھا۔ (TWO - NATION THEORY) یعنی اس نظریہ پہ کہ تمام مسلمان دین کے اشتراک کی بناء پہ ایک قوم ہیں، اور غیر مسلم دوسری قوم۔ خود (TWO NATION) یا دو قوم کے الفاظ یہ واضح کر رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو ایک (NATION) یا قوم بنا رہے تھے۔ ان کی پارٹی نہیں بنا رہے تھے۔ اگر وہ مسلمانوں کو ایک پارٹی قرار

دیتے قرآن کا (جداگانہ مملکت کا) مطالبہ کبھی قابلِ قبول نہ ہوتا۔ نہ ہی وہ اسلامی تھا۔ مسلم لیگ ایک تنظیم تھی جو قائداعظمؒ کے اس (دوقومی) دعوے کو سیاسی پلیٹ فارم سے پیش کرتی تھی۔ ہندوؤں کے اس دعویٰ کے ابطال کے لئے کہ یہ دعویٰ مسلمان اکثریت کا نہیں۔ اس تنظیم کی اساسی ضرورت تھی۔ قائداعظمؒ اپنی ہر تقریر میں اس حقیقت پہ زور دیتے تھے کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں، نہ کہ ایک پارٹی! لہٰذا قائداعظمؒ نے مسلمانوں کو قوم بنایا تھا۔ انہیں پارٹیوں میں تقسیم نہیں کیا تھا۔

اور حرفِ آخر یہ کہ اگر (بفرضِ محال) قائداعظمؒ (یا کسی اور) نے ایسا کہا بھی ہو تو ان کا یہ عمل اسلام میں سند نہیں قرار پا سکتا۔ اسلام میں سند تو خدا کی کتاب ہی ہے، قائداعظمؒ ہو یا اقبالؒ۔ پرویزؒ ہو یا طلوعِ اسلام۔ ان کا جو فیصلہ قرآن کے مطابق ہو اسے اسلامی تسلیم کیا جائے گا۔ جو اس کے خلاف ہو، وہ مسترد کر دینے کے قابل! اور یہی ہر معاملہ میں قولِ فیصل ہے۔

آخری سوال: قانون سازی کے سلسلہ میں ملک جس بحران میں مبتلا ہو گیا ہے کیا اس سے نکلنے کی کوئی صورت بھی ہے؟

جواب:۔ بحالاتِ موجودہ تو اس کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ مذہبی فرقوں کے باہمی اختلافات اس قدر شدید ہیں کہ وہ کسی ایک نقطہ پہ پہنچ ہی نہیں سکتے۔ دوسری طرف انہوں نے حالات ایسے پیدا کر دیئے ہیں کہ اربابِ اقتدار بھی ان کے سامنے بے بس ہیں (مثال کے طور پر) عورت کی شہادت اور دیت سے متعلق قانون کو پچھلے چار سال سے بے مسئلہ بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح ایک ہی مقام پہ گردش کر دیا ہے

آپ سوچئے کہ کیا ان حالات میں اس بحران سے نکلنے کی کوئی صورت ہے۔ ہو سکتی ہے؟ علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ اس گرداب سے نکلنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ کوئی مردِ مومن عمر فاروقؓ کی سی جرأت کے ساتھ اٹھے اور کہے کہ

حسبنا کتاب اللہ

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے

جب تک یہ مسلک اختیار نہیں کیا جائیگا نہ کوئی متفق علیہ اسلامی ضابطہ قوانین مرتب ہو سکے گا نہ مملکت اسلامی بن سکے گی۔

والسلام

سؤر ملک بدر نہیں کئے جاسکتے

(شریعت حقّہ کا فیصلہ!)

ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلامی نظریاتی کونسل کا ذیلی ادارہ ہے، اور یہ دونوں وفاقی حکومت سے متعلق ہیں۔ اس ادارہ کے ترجمان، ماہنامہ فکر ونظر کی اشاعت بابت اپریل ۱۹۸۷ء میں، سوال اور جواب کی شکل میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس کا عنوان ہے:-

قرآن وسنت کی روشنی میں بیعِ خنزیر کا مسئلہ۔

پہلے سوال کو دیکھئے:

سوال ۱:- ایک تجارتی ادارے نے جو "انٹرفانا" کے نام سے موسوم ہے، اس بات کی حکومت سے اجازت چاہی ہے کہ انہیں زندہ جنگلی خنزیر برآمد کرنے کے لئے اختیار دیا جائے۔

ہمارے ملک میں جنگلی خنزیر کی تعداد بڑھتی جارہی ہے اور روزبروز ان میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ان کی تعداد میں اضافہ کی وجہ سے زراعت بُری طرح متاثر ہوتی ہے کیونکہ یہ جنگلی جانور فصلوں کو شدید نقصان پہنچاتے ہیں۔ ہماری حکومت وقتاً فوقتاً مختلف تدابیر اختیار کرتی رہی ہے تاکہ کسی طرح اس موذی جانور پر قابو پالیا جائے اور زرعی فصلوں کو نقصان سے بچایا جائے۔ فوج کے جوانوں کو خنزیر مارنے پر تعینات کیا گیا، عوام کو انعامات دے کر خنزیر مارنے پر آمادہ کیا گیا، مختلف انواع کے زہر استعمال کئے گئے لیکن ان تمام اقدامات کے باوجود خنزیر پر قابو نہ پایا جاسکا۔ یہ نئی پیشکش اسی تجارتی ادارے نے کی ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جارہا ہے کہ اگر زندہ خنزیر بڑی تعداد میں برآمد کرنے کی اجازت دے دی جائے تو ان سوروں کی تعداد میں نمایاں کمی ہو جائے گی اور وقت گذرنے کے ساتھ ہماری زرعی فصلوں کو نقصانات سے بچایا جاسکے گا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تجارتی ادارے کے لئے سوروں کو برآمد کرنا اسلامی

نقطہ نظر سے جائز قرار دیا جا سکتا ہے؟ دوسرے یہ کہ ہماری حکومت کو خنزیر برآمد کرنے کی اجازت دینے کا استحقاق اسلامی نقطہ نظر سے حاصل ہے یا نہیں؟

رسالہ میں یہ نہیں بتایا گیا کہ مستفسر کون ہے؟ سوال کے انداز سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ استفسار خود حکومت کے اس شعبہ کی طرف سے کیا گیا ہے جس کا تعلق ملک کی درآمدات و برآمدات سے ہے۔ اگر ہمارا یہ اندازہ (یا قیاس) صحیح ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں اس استفسار کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ ملک سے سینکڑوں چیزیں برآمد کی جاتی ہیں۔ ان میں (حرام حلال) زندہ جانور بھی ہوتے ہیں اور ان کی کھالیں، ہڈیاں، منجمد خون، انتڑیاں ذخیرہ بھی۔ حکومت بالعموم انھیں فروخت کرتی ہے۔ جب ان اشیاء کی برآمدات اور بیع سے متعلق اس قسم کے استفسار کی ضرورت پیش نہیں آئی تو خنزیر میں کون سی خصوصیت ہے جس کی رُو سے اس فتویٰ کی ضرورت لاحق ہو گئی؟

خود سوال میں اس کا اعتراف کیا گیا ہے کہ یہ جانور فصلوں کو شدید نقصان پہنچاتا ہے اور اس کے سدباب کیلئے جس قدر تدابیر اختیار کی گئی ہیں ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ ان حقائق کے پیش نظر جس فرم نے زندہ جنگلی خنزیر برآمد کر کے ملک کو اس تباہی سے بچانے کی پیشکش کی ہے، حکومت کو اسے شکریہ کیساتھ قبول کر کے ضروری شرائط طے کر لینی چاہیئے تھیں۔ یہی عقلِ عام، مفادِ مملکت اور مصالح ملی کا تقاضا تھا اور یہی قرآن کا منشا۔ قرآن کریم نے فصلوں اور انسانی نسلوں کی ہلاکت کو سنگین جرم قرار دیا ہے جہاں کہا ہے کہ وَاِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَ یُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ (۲/۲۰۵)

"جب اقتدار کسی مفسد کے ہاتھ میں آجاتا ہے تو وہ ملک میں الاقانونیت پھیلا دیتا ہے اور فصلوں اور انسانی نسلوں کو تباہ کر دیتا ہے۔ خدا کو اس قسم کی فساد انگیزی قطعاً پسند نہیں"۔ لہٰذا ہر وہ کوشش اور تدبیر جو فصلوں کو تباہی سے بچانے کا موجب ہو منشاءِ خداوندی کے مطابق ہوگی، خواہ وہ تباہی انسانوں کے ہاتھوں سے ہو اور خواہ جانوروں کی وجہ سے۔ بنا بریں اس سوال کا جواب (بلا توقف و بلا تامل) یہ ہونا چاہیئے تھا کہ حکومت کو یہ پیشکش بشکر قبول کر لینی چاہیئے

لیکن یہ سوال ایک بہت بڑے مولانا صاحب سے پوچھا گیا ہے جن کے ہاں امور شریعت میں نہ قرآن کو بار یابی حاصل ہوتی ہے نہ علم و عقل کو کوئی دخل۔ ان کا جواب یہ ہے کہ:-

خنزیر کا برآمد کرنا جب یقیناً بیع کے مترادف ہے تو کسی تجارتی یا غیر تجارتی ادارے یا کسی مسلمان کے لیے کتاب و سنت کی روشنی میں خنزیر برآمد کرنے کی اجازت نہیں۔

از روئے شریعت اسلامیہ خنزیر مال نہیں اس لیے اس کی بیع حرام ہے۔

اس حرمت کی سند کیا ہے؟ فرمایا تفسیر مظہری میں یوں آیا ہے۔ تفسیر کبیر نے یوں کہا ہے۔ یہی عبارت تفسیر خازن میں ہے ہدایہ میں صاف موجود ہے جہاں اس نے تحریر فرمایا ہے۔ وغیرہ۔

یعنی ان مفسرین اور مقننین حضرات کو حق حاصل ہے کہ جس چیز کو چاہے حرام قرار دے دیں، اور تمام امت تا قیامت تک، ان کے فیصلوں کی پابند ہوگی۔ قرآن کریم اس قسم کے مسلک کے متعلق کیا کہتا ہے، اس کی بابت آگے چل کر لکھا جائے گا۔ سر دست یہ دیکھیئے کہ خنزیر کے متعلق

اس نے کیا کہا ہے۔

قرآن کریم نے کھانے پینے کی چار چیزوں کو حرام قرار دیا ہے سورۂ انعام میں ہے (اور یہی حکم دیگر آیات میں بھی آیا ہے)

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ ... (۸/۲۶)

(اے رسول!) تو کہہ دے کہ میں نہیں پاتا اس وحی میں کہ مجھ کو پہنچی ہے کسی چیز کو حرام، کھانے والے پر جو اس کو کھاتے، مگر یہ کہ وہ چیز مردار ہو یا بہتا ہوا خون یا گوشت سور کا کہ یہ رجس ہیں یا جسے اللہ کے سوا کسی اور کیطرف منسوب کیا جاتے۔ یہ فسق ہے۔۔۔۔

اس آیت سے ہم سر دست اس نکتہ کو نمایاں طور پر سامنے لانا چاہتے ہیں کہ ان چیزوں کو کھانے کے لئے حرام قرار دیا گیا ہے۔ انکے اور طرح کے استعمال کو حرام قرار نہیں دیا گیا۔ خنزیر کے ضمن میں بالخصوص "لحم خنزیر" (سور کے گوشت) کو حرام قرار دیا گیا ہے لہذا یہ کہنا کہ ان کی (یا ان میں سے سور کی) بیع (فروخت) یا برآمد بھی حرام ہے قرآن سے ثابت نہیں۔

خنزیر کی بیع کے حرام ہونے کی دلیل یہ دی گئی ہے:۔

"اِنَّهٗ رِجْسٌ" صرف خنزیر کے لیئے وارد ہوا ہے اس لیے نجس العین خنزیر ہی ہے اور اس کی یہ حرمت اور نجاست لعینہ اس کی بیع کے حرام ہونے کی دلیل ہے

پہلی بات تو یہ ہے کہ سورہ انعام (۸/۲۶) میں "انہ رجس" صرف لحم خنزیر کیلئے نہیں کہا گیا۔ یہ ان تمام چیزوں کے لیے آیا ہے جنہیں اس آیت میں حرام قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے اس کا ترجمہ کیا ہے:۔

مردار ہو۔ یا بہتا ہوا خون ہو یا سور کا گوشت ہو، کہ یہ چیزیں بلاشبہ گندگی ہیں۔

(ترجمان القرآن جلد اول۔ صفحہ ۔۔)

حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان کے حرام ہونے کی علت یہ ہے کہ وہ رجس ہیں۔ یہ نہیں کہ حرام اشیاء میں سے سور کا گوشت تو رجس (ناپاک) ہے اور باقی چیزیں پاک ہیں۔ قرآن کی رو سے تمام حرام اشیاء ایک ہی زمرہ میں داخل ہیں۔ گائے بیل۔ بھیڑ بکری حلال ہیں۔ لیکن اگر وہ (بغیر ذبح کیے) مر جائیں تو ان کا گوشت (میتۃ) اور لحم خنزیر کا شمار ایک ہی زمرہ میں ہوگا۔ دونوں حرام ہوں گے۔

(۲) مولانا صاحب نے دوسری بات یہ فرمائی ہے کہ رجس صرف خنزیر کے لیے وارد ہوا ہے۔ اس لیے نجس العین خنزیر ہی ہے۔

رجس اور نجس دو الگ الگ الفاظ ہیں۔ خنزیر اور دیگر حرام چیزوں کے لیئے رجس کا لفظ آیا ہے نجس کا نہیں۔ لہذا یہ کہنا کہ خنزیر کے لیے رجس کا لفظ آیا ہے۔ اس لیے وہ نجس العین ہے۔

اور نجس العین کی بیع حرام ہے نہ قرآن کی رُو سے صحیح ہے نہ منطق کی رُو سے قرآن نے نہ خنزیر کو نجس العین کہا ہے اور نہ ہی نجس العین کی بیع کو حرام قرار دیا ہے۔ اسے قرآن کی طرف منسوب کرنا افترا ہے۔

۳ فرماتے ہیں:۔

درندے حرام ہیں لیکن وہ بھی نجس العین نہیں۔ دباغت کے بعد ان کی کھالیں پاک ہو سکتی ہیں۔ لیکن خنزیر نجس العین ہے اس کی کھال کسی حال میں بھی پاک نہیں ہو سکتی۔ اس لیے علماء امت جنہوں نے دباغت کے بعد کھال میں تجارت کو جائز قرار دیا، خنزیر کی کھال میں تجارت کو جائز نہیں کہتے۔ جب ان کے نزدیک اس کی کھال بیچنا بھی ناجائز ہے تو خنزیر کا بیچنا ان کے نزدیک کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔

یہ "علماء امت" (بقول سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم) کون سے انبیاء ہیں جن کے فیصلے وحی خداوندی کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں!

حرام اور حلال

آپ قرآن کریم کے اوراق شروع سے آخر تک الٹتے جایئے آپ دیکھیں گے کہ حرام اور حلال کا اختیار خدا نے اپنے پاس رکھا ہے۔ کسی انسان کو اس کا اختیار نہیں دیا۔ قرآن کریم کی رُو سے دین کی اصل اساس یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے یا اس پر کسی قسم کی پابندی عائد کرے۔ کسی شے کو حرام قرار دینا پابندی کی شدید ترین شکل ہے۔ ایسی پابندی سے مراد یہ ہوتی ہے کہ آپ تمام دنیا کے مسلمانوں کو قیامت تک اپنے فیصلہ یا حکم کا پابند قرار دیتے ہیں۔ یہ ابدی محکومیت ہی نہیں، مستقل غلامی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ حرام و حلال کا اختیار اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے اور صرف اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور مسلمانوں پر جن چیزوں کو حرام قرار دینا تھا انہیں بالوضاحت قرآن میں بیان کر دیا ہے۔ اس باب میں اللہ تعالیٰ نے اس درجہ تحدید برتی ہے کہ ایک دفعہ نبی اکرمؐ نے کسی چیز کو اپنے لیے ممنوع قرار دے لیا تو فوراً وحی آ گئی کہ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (۶۶/۱) اے نبی! جس چیز کو اللہ نے تمہارے لیے حلال قرار دیا ہے تم نے اسے اپنے لیے ممنوع کیسے قرار دے لیا؟ جب رسولؐ اللہ کو اپنی ذات کے لیے بھی اس قسم کی پابندی عائد کرنے کا اختیار نہیں تو امت کے لیے حرام اور حلال کا اختیار انسانوں کو کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ (تفصیل ان امور کی پرویز صاحب کی لغات القرآن میں زیر باب "حرام" دیکھیے) مذاہب سابقہ میں انکے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) نے یہ اختیارات اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ یہ انہیں خدا بنا لینا ہے۔ لہٰذا شرک ہے۔ سورۂ توبہ میں ہے اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۹/۳۱) انہوں نے اپنے علماء و مشائخ کو خدا سے ورے ہی خدا بنا رکھا ہے" اس کی تفسیر میں نبی اکرمؐ کا ارشاد گرامی نہایت واضح ہے:۔

حضرت عدیؓ بن حاتم سے مروی ہے کہ جب میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو عیسائی تھا اور میرے گلے میں صلیب پڑی ہوئی تھی۔ حضورؐ نے دیکھ کر فرمایا۔ عدی! اس بت کو گلے سے اتار پھینک۔ اس وقت آپ سورۃ توبہ تلاوت فرما رہے تھے۔ جب یہ آیت آئی۔ اتخذوا احبارھم ..... تو میں نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! ہم نے ان لوگوں کو کبھی رب نہیں بنایا فرمایا! مگر کیا یہ واقعہ نہیں کہ خدا نے جو چیز حرام کی ہے۔ اُسے یہ لوگ تمہارے لیئے حلال کر دیتے ہیں اور تم اسے حلال سمجھنے لگ جاتے ہو۔ اور خدا نے جو چیز حلال قرار دی ہے اُسے یہ لوگ حرام کر دیتے ہیں اور تم حرام سمجھنے لگ جاتے ہو۔ میں نے اقرار کیا کہ بیشک واقعہ یہی ہے۔ تو فرمایا! یہی تو انھیں خدا بنا لینا ہے

(جامع بیان العلم۔ ابن عبدالبر)

ہم پوچھتے ہیں ارباب فکر و دانش سے کہ کیا یہی کچھ ہم نہیں کر رہے؟! اسی مسئلہ زیر نظر کو لیجیئے۔ خنزیر کی بیع یا برآمد کو خدا نے کہیں حرام قرار نہیں دیا۔ اور یہ صاحب اسے حرام قرار دے رہے ہیں اور اس کے پیچھے اتھارٹی یہ بتلاتے ہیں کہ فلاں امام نے یہ کہا ہے۔ فلاں مفسر کا یہ قول ہے۔ فقہ کی فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے۔ علماء امت کا اس پر اتفاق ہے۔ کیا یہ احبار و رہبان کو خدا کا مقام دے دینا نہیں! اس کے جواب میں کہا یہ جاتا ہے کہ یہ ائمہ اور فقہا خدا کے احکام کے مطابق ہی ایسا کہتے ہیں۔ اپنی طرف سے ایسا نہیں کہتے۔ اگر یہی بات ہے تو وہ (یا آپ حضرات) خدا کا وہ حکم تو پیش کریں جس کی رو سے وہ ایسا کہتے ہیں! آپ فرماتے ہیں کہ خنزیر نجس العین ہے۔ (حالانکہ خدا نے ایسا نہیں کہا) اور نجس العین کی بیع (یا برآمد) حرام ہے (خدا نے ایسا بھی نہیں کہا) تو آپ کا حرمت کا فتویٰ، ارشادِ خداوندی کے مطابق کیسے ہو گیا؟ یہ تو ان کا (یا آپ کا) اپنا فیصلہ ہے جس کی خدا نے قطعاً اجازت نہیں دی۔ مَا لَمْ یَأْذَنْ بِہِ اللّٰہُ .... (۴۲/۲۱)

ان حضرات کی ٹیکنیک عجیب ہوتی ہے۔ ان سے کچھ پوچھو تو یہ کبھی نہیں کہیں گے کہ میرا فتویٰ یہ ہے۔ ہمیشہ یہ کہیں گے کہ فلاں امام نے یہ کہا ہے۔ فلاں مفسر کا یہ قول ہے۔ سلف صالحین کا یہ ارشاد ہے۔ یعنی یہ اس کی ذمہ داری اپنے سر پر نہیں لیتے۔ اسلاف کو اتھارٹی قرار دیتے ہیں۔ لیکن جب یہ وفات پا جاتے ہیں تو سلف صالحین کے زمرے میں شامل ہو جاتے ہیں اور ان کے بعد آنے والے انہیں بطور اتھارٹی (QUOTE) کرتے ہیں۔ یعنی ان میں سے جو اپنی زندگی میں اتھارٹی نہیں سمجھا جاتا تھا وہ مرنے کے بعد اتھارٹی قرار پا جاتا ہے اسطرح زندہ امت، ابدی طور پر مُردوں کی محکوم اور غلام بنی رہتی ہے۔

مولانا صاحب نے اپنے فتویٰ کے آخر میں اس مشکل کا حل بھی تجویز فرما دیا ہے جس کے لیئے ان سے یہ سوال پوچھا گیا تھا۔ فرماتے ہیں:۔

اپنے ملک کی زراعت کو خنزیر کی تباہی سے بچانے اور اس لعنت سے نجات پانے کیلئے

یہی مؤقف کتاب و سنت اور شریعتِ اسلامیہ کی رُو سے متعین ہے کہ ہماری حکومت غیر اسلامی ممالک کے غیر مسلم باشندوں کو ہمارے ملک سے خنزیر برآمد کرنے کی اجازت دے دے جب کہ یہ برآمد کرنا بیع کے مترادف نہ ہو اور برآمد کرنے والوں سے کوئی قیمت نہ لی جائے۔

سوال یہ ہے کہ اگر غیر اسلامی ممالک کے غیر مسلم باشندوں میں سے کوئی اس کے لئے تیار نہ ہو، تو پھر کیا کیا جائے؟ پھر سؤروں کو بڑھنے پھولنے، پھیلنے اور فصلوں کو تباہ و برباد کرنے دیا جائے!

تھیا کریسی مولانا صاحب کے اس فیصلہ (یا فتویٰ) کے نتائج کس قدر دور رس ہیں، یہ سوال غور طلب ہے۔ مولانا صاحب حنفی العقیدہ فرقہ کے ایک ممتاز راہنما ہیں۔ ہماری حکومت، فقہ حنفی کو اسلامی شریعت تسلیم کر چکی ہے اس لئے مولانا صاحب کا یہ فتویٰ شرعی حکم کی حیثیت اختیار کر لے گا۔ اب صورتِ حال یہ ہو گی کہ ملک میں سؤروں کی تعداد بڑھتی چلی جائیگی۔ خود سوال میں مذکور ہے کہ، ایک مادہ سؤر سال میں تقریباً بارہ بچے جنتی ہے۔ فصلیں اجڑتی جائیں گی۔ آبادیاں برباد ہوتی جائیں گی (جنگلی سؤر انسانوں پر بھی حملہ کر دیتے ہیں)۔ لیکن حکومت اس کے تدارک کے لئے کچھ نہ کر سکے گی۔ علاج اس فتنہ کا یہی ہے کہ سؤروں کو برآمد کیا جائے۔ حکومت اگر یہ تدبیر اختیار کریگی تو شور مچ جائے گا کہ یہ خلافِ شریعت ہے۔ یہ ہوتا ہے تھیا کریسی میں۔ تھیا کریسی میں ایسا شاذ ہی ہوتا ہے کہ علماء حضرات اپنے فتووں کو ملکی قوانین کی حیثیت سے نافذ کریں۔ ہوتا یہی ہے کہ فیصلے ان کے ہوتے ہیں اور حکومت انہیں نافذ کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ ہم نے اکثر کہا ہے کہ تھیا کریسی سے سیکولرازم کہیں بہتر ہوتی ہے۔ قرآن جو دین یا اسلامی نظام کی اصل و بنیاد ہے، دونوں میں نہیں ہوتا لیکن سیکولرازم میں مصالحِ مملکت، قومی مفاد، منفعتِ عامہ کا تو خیال رکھا جاتا اور علم و عقل کی رُو سے فیصلے کئے جاتے ہیں تھیا کریسی میں نہ وہ ہوتا ہے نہ یہ۔ اس میں نہ دین باقی رہتا ہے نہ دنیا خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ۔ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ (۲۲/۱۱) اقوامِ مغرب نے اسی تھیا کریسی کے ہاتھوں "تنگ آکر" سیکولرازم کا نظام اختیار کیا تھا۔ خدشہ ہے کہ اگر ہمارے علماء حضرات اسی طرح قرآن اور عقل کے راستے میں روک بن کر کھڑے رہے، تو ہماری نئی نسل سیکولرازم اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ ہمارا ملک بڑی تیزی سے اس راستے پر گامزن ہے۔

یہ فتویٰ البتہ ایک طبقہ کے حق میں جا سکتا ہے۔ فصلوں اور نسلوں کو حیوانی سؤر ہی تباہ نہیں کرتے۔ "انسانی سؤر" بھی تباہ کرتے ہیں، اور کہیں زیادہ شدت کے ساتھ۔ اگر کل کلاں کو کسی حکومت نے ان "انسانی سؤروں" کو ملک بدر کرنے کا فیصلہ کر لیا تو وہ شرعی عدالت میں اس بنیاد پر رٹ دائر کر سکیں گے کہ اگر حیوانی سؤروں کو ملک بدر کرنا خلافِ شریعت ہے تو انسانی سؤروں کو ملک بدر کرنا کس طرح جائز قرار پا سکتا ہے! آپ اس پر تعجب نہ کریں۔ فقہ کی کتابوں میں آپ کو اس سے کہیں زیادہ تعجب انگیز مسائل ملیں گے۔ دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ ہفت روزہ الاعتصام (لاہور) جماعتِ اہلحدیث کا ممتاز ترجمان ہے۔ اس میں ایک نہایت اہم مسئلہ پر سلسلہ بحث چلا آرہا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ایک شخص نے بھینس کے ساتھ جنسی اختلاط کر لیا۔ اس کے لئے شریعت کا کیا حکم ہے؟ لمبی چوڑی بحث کے بعد فیصلہ یہ کیا گیا ہے کہ اس پر حد تو واجب نہیں آتی۔ اسے تعزیر کی سزا دی جائے گی۔ لیکن اس سے بھی اہم شق اس کے بعد آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس بھینس کا کیا کیا جائے؟ اس کے متعلق بھی بڑی تفصیلی تحقیق کے بعد کہا گیا ہے کہ:

> اس شخص سے بھینس کی قیمت وصول کر کے بھینس کے مالک کو دے کر اس بھینس کو ذبح کر کے دفن کر دیا جائے۔

(الاعتصام۔ (۲۰) اپریل ۱۹۸۴ء تک)

اور یہ تو قارئین کو معلوم ہی ہے کہ بخاری شریف اور اس کی شرح فتح الباری کی رُو سے بندروں نے ایک "زانی بندر" کو رجم کی سزا دی تھی جس میں اس روایت کے راوی (حضرت عمرو بن میمونؓ) نے خود بھی حصہ لیا تھا۔ (طلوعِ اسلام بابت ستمبر ۱۹۷۹ء ص۵۶) معتبر ترین کتبِ فقہ، مثل ہدایہ، درمختار، عالمگیری وغیرہ میں وضو، غسل، روزہ وغیرہ ابواب کے ذیل میں جس قسم کے مسائل درج ہیں، ان کا ذکر کرنا تو ایک طرف، ان کے تصور تک سے حیا مانع ہے۔

آخر میں چند الفاظ خود ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے متعلق جس کے جریدہ، فکر و نظر میں اس قسم کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس ادارہ کا منصب یہ ہے کہ ہر پیشِ نظر معاملہ کے متعلق تحقیق کے بعد بتائے کہ اسلام کا اس باب میں فیصلہ کیا ہے (جیسا کہ خود اس کے نام سے ظاہر ہے) یہی اس ادارہ کے وجود کی وجہ جواز ہے۔ لیکن اس نے اپنے رسالہ کے پہلے صفحہ پہ لکھ رکھا ہے کہ

> فکر و نظر میں کسی مضمون کی اشاعت کا یہ مطلب نہیں کہ ادارہ ان افکار و خیالات

سے لازماً متفق ہے جو اس میں پیش کئے گئے ہیں۔
یعنی اس ادارہ کا منصب اتنا ہی ہے کہ جو مضمون اسے موصول ہو اسے بلا تحقیق رسالہ میں شائع کر دیا جائے۔ اگر اس سے لوگ گمراہ ہوتے ہیں تو ہوا کریں۔ اسلام پر حرف آتا ہے تو آیا کرے۔ اس کی ذمہ داری اس ادارہ پر عائد نہیں ہوتی۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے حکومت اس ادارہ پر لاکھوں روپے سالانہ صرف کرتی ہے۔
اور اس پر اس کا نام ہے۔ ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی!

ابلیس و آدم

پرویز صاحب نے جب سلسلۂ معارف القرآن شروع کیا تو من دیزدان (اللہ) کے بعد دوسری جلد ابلیس و آدم کے عنوان سے شائع کی تھی۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا تھا اور تیسرا ایڈیشن ۱۹۷۲ء میں۔ اس کے بعد یہ کتاب کمیاب تھی۔ اس لئے اس کا چوتھا ایڈیشن شائع کرنا پڑا

کتاب کے مشمولات سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگ سکتا ہے۔

۱۔ انسان کی تخلیق۔
۲۔ نظریۂ ارتقا۔
۳۔ قصۂ آدم۔
۴۔ ابلیس
۵۔ شیطان۔
۶۔ جنات۔
۷۔ ملائکہ۔
۸۔ روح (نفس)
۹۔ وحی (کشف و الہام)
۱۰۔ نبوت اور رسالت۔
۱۱۔ کیا تمام مذاہب سچے ہیں؟

کتاب دستیاب بہترین سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔ بڑی تقطیع ضخامت پونے چار سو صفحات۔
جلد مضبوط خوبصورت مزین اور مطلا قیمت فی جلد ۷۵/- روپے علاوہ محصول ڈاک
ملنے کا پتہ: ادارہ طلوع اسلام ۲۵۔بی گلبرگ نمبر ۲۔ لاہور

ہم بھول کیسے سکتے ہیں؟

(ڈاکٹر صلاح الدین اکبر)

آئے دن کے آئینی بحرانوں کا ایک بڑا نقصان یہ بھی ہوا کہ ان لوگوں کے ذہنوں کو جنہوں نے پاکستان کو بنتے نہیں دیکھا، یا جو اس کے پس منظر سے خاطر خواہ آگاہ نہیں، مختلف قسم کے شکوک وشبہات میں مبتلا کر دیا ہے حتیٰ کہ کچھ لوگ اس کے قیام کی افادیت پر بھی شک کرنے لگے ہیں، اس سے حاصل ہونیوالی نعمتوں اور فراوانیوں سے متمتع ہوتے ہوئے بھی وہ اس سے نالاں نظر آتے ہیں،

اور ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ عناصر بھی سر اٹھانے لگے ہیں جو اس کے قیام کے مخالف تھے یا کم از کم اس کے حق میں نہ تھے، کچھ عرصے سے قومی اخبارات میں یہ لوگ اپنے ان خیالات کو منطقی سوچ کا روپ دے کر یا تاریخی حقیقتیں قرار دے کر پیش کر رہے ہیں۔

قوم جو پہلے ہی ذہنی خلفشار میں مبتلا ہے اسے بتایا جا رہا ہے کہ یہ سب نتیجہ ہے اس کے اس غلط فیصلے کا جو اس نے ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے حق میں کیا تھا، اسے کبھی ان کے موجودہ حالات کا حوالہ دے کر، کبھی ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت زار کا واسطہ دے کر یہ باور کرنے کو کہا جا رہا ہے کہ مطالبۂ پاکستان ایک غلطی تھی، اگر تم اس وقت قائداعظمؒ کی بات ماننے کی بجائے ہماری بات مانتے۔ تم ان کا ساتھ دینے کی بجائے ہمارا ساتھ دیتے۔ تو تم اس نوبت کو نہ پہنچتے، فائدے میں رہتے۔

تازہ ترین مثال اس کی مولانا سید حامد میاں صاحب کے مضامین ہیں جو انہوں نے ایک بڑے قومی اخبار میں لکھے ہیں۔ اس میں انہوں نے جمعیت علماء ہند کے فارمولے کے حوالے سے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ پاکستان کے حق میں فیصلہ کر کے مسلمانوں نے گھاٹے کا سودا کیا ہے۔

سب سے پہلی غلط فہمی جو میں دور کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ جسے یہ لوگ ایک ملک، ایک یونٹ سمجھتے ہیں، کبھی ایک ملک نہ تھا۔ اس کی سرحدیں سلطنتوں کے قیام اور

تمام کے ساتھ پھیلتی اور سکڑتی رہیں۔ اشوک کے عہد میں ہندوستان کی سرحدیں اور تھیں، تغلقوں اور خلجیوں کے عہد میں کچھ اور۔ مغلوں کے مختلف بادشاہوں کے عہد میں اس کا حدود اربعہ تبدیل ہوتا رہا اور جسے ہم ۱۹۴۷ء تک ہندوستان کہتے تھے، وہ دراصل برطانیہ کے زیرِ انتظام اس کی سلطنت کا جگمگاتا ہوا ہیرا، برٹش انڈیا تھا جس میں اشوک کے عہد کا افغانی علاقہ یا مغلوں کے عہد کا علاقہ شامل نہ تھا جب کابل کا گورنر دہلی سے مقرر ہوتا تھا، اس میں صوبے انتظامی ضرورت کے تحت محدود کئے گئے تھے۔

ہم نے ۱۹۴۷ء میں ایک قوم کی حیثیت سے اپنے حق خود ارادیت کو استعمال کرتے ہوئے (جو ہمارا حق تھا) اپنے لئے ایک ہوم لینڈ حاصل کیا تھا، کسی گائے کو کاٹ کر اس کے دو حصے نہیں کئے تھے۔ ایسا ہم نے کیوں کیا تھا اس کے متعلق میں ابھی عرض کروں گا۔ پہلے ذرا ایک دو اور باتوں کی طرف اشارہ کر دوں تو مناسب ہوگا۔

ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم، مسلمان شہنشاہیتوں کے متعلق جذباتی انداز میں سوچتے ہیں۔ ہماری نظر ان کی بنائی ہوئی وسیع و عریض عالیشان مسجدوں تک رہ جاتی ہے اور ہم انہیں عظیم مسلمان سربراہانِ مملکت کا رتبہ دے کر سر آنکھوں پہ بٹھا لیتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ان کے محض ذوقِ تعمیر کی نمود ہو۔ (انہوں نے مقبرے بھی بڑے شاندار تعمیر کرائے تھے اور باغ اور بارہ دریاں بھی)۔ مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کی توجہ دراصل اپنی سلطنتوں کو مضبوط بنانے پہ ہی مرکوز رہی اور اس کے لئے انہیں جو بھی سیاسی حکمتِ عملی اختیار کرنا پڑی، کرتے رہے۔ غیر مسلموں کی امورِ سلطنت میں شرکت ہو یا ان کی عورتوں کا حرم میں شمول، راجواڑوں کو رام کرنے کے لئے رشتے جوڑنے ہوں یا اپنے بھائیوں کا قتل، سب کچھ روا تھا۔ حتیٰ کہ غیر مسلموں کو خوش کرنے کے لئے دین میں آمیزش تک انہیں قبول تھی۔ ورنہ یہ نہ ہوتا کہ صدیوں کی حکومت کے بعد مسلمان دارالسلطنت میں بھی اقلیت ہوتے رہے۔ تو یہی سمجھتا ہوں کہ اس سارے عرصے میں، ملک بھر میں پھیلے ہوئے ان گنت راندۂ درگاہ غریب غربا، مظلوم لوگوں تک اسلام کا مساوات کا پیغام نہ پہنچا۔ اس آفتاب کے نور سے وہ محروم رہے۔ ورنہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کروڑوں شودر ذلت کی گہرائیوں سے نکل کر عزتِ نفس کے حصول کے حامل پیغام کی طرف نہ لپکے۔ انہوں نے اس طرف آنا پسند نہ کیا! کون انسان ذلیل و مجبور رہنا پسند کرتا ہے جب اس کے سامنے سرفرازی و سربلندی کے راستے کھلے ہوں۔ اصل بات یہی ہے کہ یہ راستے انکی نگاہوں سے اوجھل رہے۔ مسلمان حکمرانوں کے دور میں بھی وہ بدستور کسی پنج ہزاری، کسی ہفت ہزاری کی فوج کے پیادے ہی رہے۔ غلام کے غلام، مجبور و مقہور، بے کس و بے بس حاکم کے مسلمان ہونے سے ان کے شب و روز میں کوئی فرق نہ آیا۔

اسلام تو ہر نوعِ غلامی کے لئے پیامِ مرگ ہے۔ پھر وہ کیوں انکی شبِ تار کو سحر نہ کر سکا۔ اس لئے کہ وہ حضور رحمۃ اللعالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اسلام نہ تھا، کسی ظل اللہ کا مذہب تھا۔

سینتیس (۳۷) سال بعد یہ باتیں دوبارہ یاد دلانے، یہ بحثیں پھر سے چھیڑنے میں کیا مصلحت ہے؟ یہ فارمولے جنہیں قوم نے ایک بار رد کر دیا تھا، کیوں ہمیں پھر یاد دلائے جا رہے ہیں؟ وہ رہنما جنکی رہنمائی کو قوم نے رد کر دیا تھا، پھر سے ان کی شخصیتوں کو ملت کا ہمدرد، مونس و غم خوار بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ ان کے ماضی کے ان گوشوں، ان کی تحریروں سے ایسے ایسے اقتباس تلاش کر کے سامنے لائے جا رہے ہیں جن سے انہیں ملت کی عظمت کا نقیب ثابت کیا جائے۔ بلا وجہ شخصیتوں کو ایکدوسرے کے مدِ مقابل کھڑا کیا جا رہا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں، اگر قائدِ اعظمؒ کی تعریف جائز ہے تو مولانا مدنی کی تعریف کیوں جائز نہیں۔؟

پاکستان کے رہنے والے اگر اس شخص کی تعریف کریں جسکی فہم و فراست، جسکی شب و روز کی محنت، جس کے کردار کی عظمت اور سیاسی سوجھ بوجھ نے انگریز، ہندو اور ان کے ہم نوا مسلمانوں کے سارے ہتھکنڈوں کے باوجود مسلمانوں کو ایک آزاد و خود مختار مملکت کا مالک بنا دیا، جہاں وہ اپنی زندگیاں اپنے دین کے مطابق گزار سکنے کے قابل ہو سکے اور جہاں وہ آج اپنے خوابوں سے بھی بڑھ کر خوشحال زندگی گزار رہے ہیں، تو وہ اپنا ایک فرض ہی ادا نہیں کر رہے ہوتے، ایک قرض کی ادائیگی بھی کر رہے ہوتے ہیں جو اس عظیم شخصیت کی طرف واجب الادا ہے۔

لیکن ہم ان کے مخالفین کی تعریف کیوں کریں، جو اگر کامیاب ہو جاتے تو ہم زندگی کی ان فراوانیوں سے آشنا ہی نہ ہوتے اور ہمارا بھی وہی حال ہوتا جو اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کا ہے جہاں جب کسی مسلمان گروہ میں اپنے زورِ بازو، اپنی ہنرشناسی سے ذرا سی خوشحالی کی رمق بھی آنے لگتی ہے تو ہندو غنڈے ان کے گھر بار کو جلا کر خاکستر کر دیتے ہیں اور آئے دن قتل و غارت کا بازار گرم رہتا ہے۔ ہمارا حال بھی وہی ہوتا جو جبل پور کے مسلمانوں کا ہوا، جو الہ آباد اور علی گڑھ میں ہوا، خود دلی میں ہوا اور تازہ تازہ بمبئی اور اس کے مضافات میں دیکھنے میں آیا ہے۔

قائدِ اعظمؒ کے مقابل میں مولانا مدنی مرحوم کا نام لیکر مولانا نے ایکبار پھر علامہ اقبالؒ اور مولانا مدنیؒ کی اس تاریخی بحث کا ذکر چھیڑ دیا ہے جو جانے کتنی بار چھڑ چکا ہے۔ اور جسے بقول خود ان کے، علامہ اپنی زندگی میں ختم کر چکے تھے، مگر اس بار انہوں نے جسٹس جاوید اقبال سے یہ اپیل بھی کی ہے کہ علامہؒ کے مجموعے سے یہ قطعہ خارج کر

جائے جس میں انہوں نے کہا تھا "زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست" علامہؒ نے تو واقعی اس بحث کو ختم کر دیا تھا مگر نہ جانے ضمیر کی وہ کون سی خلش ہے جو بار بار انکو اس پہ اکساتی ہے کہ اس بحث کو سینتیس سال بعد بھی چھیڑیں۔ خود مولانا مدنی نے علامہ کی وفات کے چھ ماہ بعد ہی اس بحث کو دوبارہ چھیڑ دیا تھا۔ جب علامہ اس کے متعلق کچھ کہہ سکنے کے لئے اس دنیا میں موجود نہ تھے ——— اس لئے یہ قطعہ[1] اس وقت تک موجود رہنا چاہیئے جب تک اس قسم کے بحث مباحثوں کا امکان باقی ہے، یہ نہیں کہ آپ کے حمد و جین کی وہ تقریریں اور تحریریں تو باقی رہیں جن سے اس بحث کا سلسلہ شروع ہوا اور یہ قاطع برہان قطعہ موجود نہ رہے!

مولانا سید حامد میاں صاحب نے مولانا مدنی کی جس تقریر اور تحریر کا ذکر کیا ہے اس میں سے انہی کے دیئے ہوئے یہ دو ٹکڑے پیش کرتا ہوں۔

"لہٰذا ضرورت ہے کہ تمام باشندگانِ ملک کو منظم کیا جائے۔ اور ان کو ایک ہی رشتہ میں منسلک کر کے کامیابی کے میدان میں گامزن بنایا جائے"

یہ کہنا کہ "موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں یہ اس زمانے کی ہوا نوالی نظریت اور ذہنیت کی خبر ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ ہم کو ایسا کرنا چاہیئے۔ یہ خبر ہے انشاء نہیں"

ان دونوں کو ملا کر پڑھئے تو کیا خبر اور انشاء کی بحث لفظوں کا چکر بن کر نہیں رہ جاتی۔ اور پھر بات صرف لفظوں کی نہیں رکھنے کی بھی نہیں، عمل کی ہے۔ عملی طور پر ان کی سیاست کا وزن کس پلڑے میں رہا، کانگریس سے ان کے روابط کی قربت اور گہرائی کسے نہیں معلوم ——— اور کانگریس باہر سے کتنی ہی سیکولر کیوں نہ بنے، اندر سے کٹر ہندو تنظیم کے سوا اور کیا تھی۔ اور کیا ہے؟ ——— مرحوم ایم اے ایچ اصفہانی کی کتاب "قائداعظم اینڈ آئی نیو ہم" میں ایک واقعہ پڑھا تو ذہن کو ایک دھچکا سا لگا۔ بہت افسوس ہوا۔ اور افسوس اس بات کا بھی ہوا کہ اس کی تغلیط کسی نے نہیں کی۔ اور اب جب نہ وہ دو اصحاب زندہ ہیں اور نہ اصفہانی صاحب، کسی کی تردید بھی کوئی معنی نہ رکھے گی۔ قیامِ پاکستان کے ۳۷ سال بعد ان حکایتوں کو پھر سے تازہ کرنا کوئی خوشگوار بات نہیں مگر مولانا دلیل اور تاریخی حقیقتوں کا ذکر درمیان میں لے آئے ہیں تو یہ واقعہ بھی دہرانا ہی پڑتا ہے۔

بات ہے مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی پہلی میٹنگ کی، جون ۱۹۳۶ء اصفہانی صاحب

---

[1] یہ قطعہ تو ایک ابدی حقیقت کا آئینہ دار ہے (کہ اسلام میں قومیت کا معیار اشتراکِ ایمان ہے، نہ کہ اشتراکِ وطن) اس لئے یہ اگر حرف و صوت میں باقی نہ بھی رہا تو اس کی روح زندۂ جاوید رہے گی۔ طلوعِ اسلام

لکھتے ہیں۔ (ترجمہ میرا ہے۔ اصل کتاب کے صفحہ ۲۳/۲۴ پر ملاحظہ فرمالیجئے)

"مجھے یاد ہے پہلے دن مفتی کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی نے مسٹر جناح کی حمایت کرتے ہوئے ان کی ان کوششوں کو سراہا جو وہ مسلم لیگ کو عملی سیاست کے میدان میں لانے کے سلسلے میں کر رہے تھے لیکن آخری دن ان دو عالم حضرات میں سے ایک نے کہا کہ لیگ کو ووٹ کے میدان میں کامیابی دلانے کے لئے مسلسل اور موثر پراپیگنڈے کی ضرورت ہوگی، اس مقصد کے لئے دیوبند اپنی ساری مشینری لیگ کے لئے وقف کرنے کو تیار رہے۔ اس شرط پر کہ لیگ اس کا خرچہ برداشت کرے۔ اس کی ابتداء کے لئے، ان کے اندازے کے مطابق پچاس ہزار روپے درکار تھے۔ مولانا حضرات ہم میں سے اکثر سے زیادہ لیگ کی مالی حالت سے واقف تھے، مسٹر جناح کو انہیں بتانا پڑا کہ نہ تو ایسا کوئی فنڈ موجود تھا اور نہ ہی مستقبل قریب میں اس کی توقع کی جاسکتی تھی۔ انہوں نے (مسٹر جناحؒ نے) سب سے اپیل کی کہ جتنا کچھ کسی کے بس میں ہے اسے بروئے کار لاتے ہوئے ہر کوئی اپنی سی کوشش جاری رکھے۔"

پھر وہ لکھتے ہیں "مولانا صاحبان کو اس سے بڑی مایوسی ہوئی۔ انہوں نے ہندو کانگریس کی طرف رجوع کیا اور کانگریس کے حق میں پراپیگنڈا کیا ــــ"

میں اس فقرے کو ادھورا چھوڑتا ہوں کیونکہ اسے مکمل کروں تو کہا جاسکتا ہے کہ میں جانبداری سے کام لے رہا ہوں مگر واقعہ کا بیان خود بہت کچھ کہہ رہا ہے۔

اسی کانگریس کے صدر مولانا آزاد جو بقول سید حامد میاں، تقسیمؔ کے مخالف تھے، بننے والے مسلمان ملک (پاکستان) کے حصے میں آنے والے صوبہ پنجاب کی تقسیم پر ختم ہونیوالی سیاست کے نمایاں حصہ دار تھے۔ یونینسٹ وزارت کو سہارا کس نے دیا تھا؟ اگر آپ بضد ہیں کہ ہم ان کی بھی تعریف کریں تو ہمیں معاف رکھئے، جن زخموں کو وقت نے مندمل کرنے کی کوشش کی ہے پھر سے ہرے نہ ہو جائیں۔

آپ ثبوت میں پیش کرتے ہیں الہلال اور البلاغ کا شعلہ بیان، شعلہ رقم ابوالکلام جو عالمگیر اسلامی امت کا دردمند تھا، ان کی عظمتِ رفتہ پر ماتم کرتا اور مستقبل کی فتح کیلئے دعوتِ جہاد دیتا تھا ــ سید صاحب! وہی مولانا آزاد بعد کے زمانے میں گاندھی کے زیرِ اثر مہاتما جی کے شرن لگ کر قصہ ماضی بن چکا تھا۔ آپ البلاغ اور الہلال کی تحریروں کا حوالہ دے کر ہمیں یہ باور نہیں کرا سکتے کہ ۱۹۳۶ء اور ۱۹۴۷ء میں بھی ابوالکلام کے وہی خیالات تھے۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی قائداعظمؒ کی اس زمانے کی باتیں ہمیں سنائے جب بقول سروجنی نائیڈو وہ ہندو مسلم اتحاد کے پیامبر تھے اور کہے کہ دیکھو قائداعظمؒ تو متحدہ قومیت

کے علمبردار تھے۔

میں توجہ دلاتا ہوں مولانا آزاد کی آخری دنوں کی کتاب انڈیا ونز فریڈم کے صفحہ ۲۲۷ کی طرف جس میں وہ حرفِ آخر کے تحت فرماتے ہیں۔ (ترجمہ میرا ہے)

لوگوں سے یہ کہنا کہ زمین کے ایسے قطعوں میں جو جغرافیائی، لسانی اور ثقافتی لحاظ سے اس قدر مختلف ہوں، مذہب کی بنا پر یگانگت اور وحدت پیدا ہو سکتی ہے، بہت بڑا فریب ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام نے ایک ایسی برادری متشکل کرنی چاہی تھی جو نسلی، لسانی، معاشی اور سیاسی حدود سے بلند ہو کر وجود میں آتی لیکن تاریخ سے یہ حقیقت ثابت ہے کہ ایک مختصر سے عرصہ کے بعد، جسے زیادہ سے زیادہ سو سال کہئے، اسلام اس قابل نہیں رہا تھا کہ وہ مختلف ملکوں کو دین کی بنیادوں پر ایک وحدت بنا سکے۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک المیہ واقعہ کا بیان ہے، لیکن یہ بیان ذہن کو کسطرف لے جاتا ہے۔ میرے سمجھنے کی بات نہیں۔ ہم کیا چاہتے تھے میں ابھی عرض کروں گا۔

رہی نیشنلسٹ مسلمانوں کے اس گروہ کی بات جو سچ مچ سمجھتا تھا کہ مسلمانوں کا فائدہ متحدہ ہندوستان میں مضبوط اقلیت کے طور پر رہنا ہے اور وہاں رہ کر اپنے کلچر، روایات اور مذہب کی حفاظت ممکن ہے، ہندو کی ذہنیت سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ ہندو مسلم فسادات کی بات نہیں کروں گا۔

سیکولر ملک میں کچھ اچھوت مسلمان ہوئے تو کیا انہیں معاف کیا گیا؟ سکھوں نے اپنے حقوق کا مطالبہ کیا تو ان کا کیا حشر ہوا؟ دربار صاحب کی دیواروں پر لگی ہوئی گولیوں کے نشان اور گری ہوئی دیواروں کا ملبہ ہندو حکومت کے انصاف کی کھلی ہوئی تصویر ہے۔

یہ بات ہمارے رہنما بہت پہلے سمجھ چکے تھے۔ انگریز سے آزادی وہ بھی چاہتے تھے۔ آزادی ان کا بھی ایمان تھا مگر وہ ایک غلامی سے نکل کر دوسری غلامی میں پھنسنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ بیک وقت انگریز اور ہندو دونوں کی غلامی سے آزادی چاہتے تھے۔

باقی رہی مذہب کی آزادی جس کا چرچا مولانا کے ممدوحین بار بار اپنی تقریروں اور تحریروں میں کرتے تھے کہ کانگریس ہمیں مذہب کی آزادی کی یقین دہانی کراتی ہے تو مولانا! یہیں تو ہمیں اختلاف ہے۔

اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے نزدیک اسلام ایک دین ہے جو رسوم و اعتقادات ہی نہیں، معاشرت، معیشت، سیاست ہر چیز پر محیط ہے۔ اس کا قیام ایک نئے معاشرے کی، ایک نئی معیشت کی، ایک نئے نظامِ حکومت کی تشکیل کا نام ہے۔ اور اس کے لئے ضرورت تھی ایک خطہ زمین کی، یہی فلسفہ تھا قیام پاکستان کے پیچھے، علامہ اقبال کا ۱۹۳۰ء کا خطبہ

الٰہ آباد اٹھا کر دیکھ لیجئے، علامہ فرماتے ہیں:۔

حق بات تو یہ ہے کہ اسلام کلیسائی نظام کا نام نہیں، یہ ایک مملکت ہے۔

اسی خطبے میں جہاں وہ ایک مسلم سٹیٹ کی وکالت کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ اس کا قیام ہندوستان اور اسلام دونوں کے مفاد میں ہے۔ ہندوستان کے لئے یہ تحفظ کی ضمانت ہے، تحفظ جو اندرونی طاقتوں کے توازن سے پیدا ہوگا ــــ" وہیں وہ یہ بھی فرماتے ہیں "اور اسلام کو اس سے یہ موقعہ ملے گا کہ وہ اس چھاپ سے نجات پا سکے گا جو عرب ملوکیت نے اس پر لگا رکھی ہے اور یوں یہ اپنے قانون، اپنی تعلیم، اپنی ثقافت کو حرکت دے کر انہیں اپنی اصلی روح اور روحِ عصر سے قریب تر لا سکے گا۔"

یہ تھا وہ تصور جس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس خطۂ پاک کا حصول ضروری ہوگیا تھا۔ اور وہ تھا آپ کے تصور کا مذہب جس کی ضمانت کانگریس متحدہ ہندوستان میں دیتی تھی، اسی کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کہا تھا،

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ناداں سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

مذہب کا۔ وہی تصور ہے جسے علامہ نے چیخ چیخ کر پکارا ہے، مذہب کے تقاضے تو سیکولر حکومت میں پورے ہو جاتے ہیں۔ لیکن اسلام جو ایک دین، ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے صرف ایک آزاد خطۂ زمین ہی میں متشکل ہو سکتا ہے۔

قیام پاکستان کے خواہاں دیوانے چاہتے تھے کہ چشمِ فلک پھر وہی نظارہ دیکھ سکے جو اس نے ایک بار دیکھا تھا۔ رنگ و نسل، زبان و کلچر سے بلند تر ایک آئیڈیل کے اشتراک سے سیسہ پلائی دیوار کی طرح کی ایک قوم جو، مولانا آزاد کے ارشاد کے بموجب اسلام نے پیدا کرنا چاہی تھی مگر ابتدائی چند دہائیوں یا زیادہ سے زیادہ ایک صدی کے بعد نہ کر سکا۔

زمانہ اسی موڑ پر رُکا ہوا تھا۔ ہم پھر وہاں سے شروع کرنا چاہتے تھے، قیام پاکستان اعلان تھا کہ۔ ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا۔

ہم شرمندہ ہیں کہ یہ خواب خواب ہی رہا۔ اس کے راستے میں حائل ہونیوالی بہت سی دیواروں میں ایک دیوار مذہبی پیشوائیت کی بھی تھی۔ احبار و رہبان کی کھڑی کی ہوئی دیوار جو خدا کے نام پر اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں اور اسطرح خدا کا نام لیکر خدا کے راستے میں حائل ہو جاتے ہیں۔

باقی رہے ہندوستان کے مسلمان اور ان کے حقوق کا تحفظ اور ان کا مستقبل؟

ہم پاکستانی ان مسلمانوں کا احسان کبھی نہیں بھول سکتے جنہیں معلوم تھا کہ ملک کے جن حصوں میں وہ رہتے ہیں وہ کبھی پاکستان میں نہیں آ سکتے اور پھر بھی وہ مسلمانوں کے لئے ایک ہوم لینڈ کی جدوجہد میں شریک ہی نہیں، اس کی صفِ اوّل میں رہے، ان کے تحفظ

سے پاکستان بنانے والے غافل کیسے ہو سکتے تھے۔

اور ان کی سب سے بڑی ضمانت، وہ بھی جانتے تھے، ہم بھی، آپ بھی۔ ان کی سب سے بڑی ضمانت ایک مضبوط اور خوشحال پاکستان تھا، ہندوستان کے دونوں بازوں پر اپنے شہپر پھیلائے تیرہ، چودہ کروڑ سرفروش انسانوں پر مشتمل ملک کے ہوتے ہوئے کس کی جرأت ہو سکتی تھی ان کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے کی۔ اور کوئی ایسا کرتا تو اسے معلوم ہوتا کہ یہ قوم تو وہ ہے جن کا خدا مظلوموں کے پکارنے پر انہیں یاد دلاتا ہے کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم سنتے نہیں ہو کہ مظلوم ہمیں پکارتے ہیں، تم ان کی مدد کے لئے کیوں نہیں اٹھتے۔ مگر مظلوموں کی پکار پر اٹھے تو وہ جو خدا کے دیئے ہوئے اصولوں کے مطابق اپنے معاشرے کو ڈھال چکا ہو، علم و عمل میں دنیا سے آگے ہو، فنِ حرب اور سامانِ حرب کے معاملے میں دشمنوں کے دلوں پر ہیبت بن کر چھا جائے۔

لیکن اس کے راستے میں بھی وہی مذہبی پیشوائیت آہنی دیوار بن کر کھڑی ہو گئی جس کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے۔ قومی ترقی کی کوئی سکیم زیرِ غور آئی، انہوں نے شور مچا دیا کہ یہ خلافِ اسلام ہے۔ ملکی فلاح کا کوئی منصوبہ مرتب ہونے لگا، دھائی مچ گئی کہ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ کھینچ تان کر یہ حضرات اسلام کو (دین کے بجائے) اسی مذہب کی سطح پر لے آئے جس سے پیچھا چھڑانے کے لئے یہ مملکت حاصل کی گئی تھی۔ اگر یہ یوں روک نہ بنتے، اور مملکت میں خدا کی کتاب کے اصولوں کو عمل پیرا اور علم و عقل کے چراغوں کو روشن ہونے دیتے تو یہاں اسی نہج کی قوم پیدا ہو جاتی جس نے کبھی کسریٰ کے محلات کو متزلزل اور قیصر کے قلعوں کو منہدم کر دیا تھا۔ اس قوم کے سامنے کسی کی جرأت نہ ہوتی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا بال بھی بیکا کر سکتا۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ اس قوم کی ایک لڑکی نے جب داہر کے قزاقی کے خلاف اپنے بھائیوں کو مدد کے لئے پکارا تھا تو پھر داہر اور اس کے لاؤ لشکر کا کیا حشر ہوا تھا؟ اور اس میں سوال صرف قوت کا نہ ہوتا۔ یہاں ایسا معاشرہ قائم ہوتا جس میں نہ کوئی کسی کا محکوم ہوتا، نہ محتاج، نہ کوئی بھوکا ہوتا نہ ننگا، نہ انسانوں میں اونچ نیچ ہوتی نہ کسی کو کسی قسم کا خوف ہوتا نہ حزن۔ نہ فکرِ فردا ہوتا نہ پریشانیٔ امروز۔ فکر ہوتا تو ایک ہی کہ کسطرح قوانینِ خداوندی کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور یہ پریشانی ہوتی تو صرف اس کی کہ کوئی قوت اس کے راستے میں مزاحم نہ ہونے پائے۔

یہ تھا وہ اسلام جسے عملاً نافذ کرنے کے لئے اس خطۂ زمین کا مطالبہ کیا گیا تھا اور جس کے راستے میں وہ علماء حضرات دیوار بن کر کھڑے ہو گئے تھے جن کی مدح و ستائش کے لئے ہمیں آج کہا جا رہا ہے:

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا!

قوم کے زخم ابھی ہرے ہیں، انہیں مت کریدئے۔

دو خدا

ارشادِ خداوندی ہے:۔

وَقَالَ اللّٰہُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰـھَیْنِ اثْنَیْنِ ۔ اِنَّمَا ھُوَ اِلٰـہٌ وَّاحِدٌ ...... (۱۶/۵۱)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دیکھنا! تم کہیں دو الٰہ نہ بنالینا۔ الٰہ وہی ایک ہے۔

یہ آیت بڑی عظیم و جلیل ہے جس کا تعلق، منکرینِ خدا سے نہیں۔ خدا کے ماننے والے، ہم مسلمانوں سے ہے۔ یہ کفر و اسلام میں خطِ امتیاز اور شرک اور توحید میں حدِ تفریق ہے۔

لیکن اس کی عظمت و جلالت۔ اس کی محکمیت اور اہمیت اسی صورت میں سمجھ میں آسکتی ہے جب اِلٰـھَیْنِ کا مفہوم سمجھ میں آجائے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ ہم شروع سے کہتے چلے آرہے ہیں کہ اسلام کی گاڑی کو دوسری (غیر اسلامی) پٹڑی پر ڈالنے کے لئے ترکیب یہ اختیار کی گئی کہ قرآن کی اصطلاحات کا مفہوم بدل دیا گیا۔ دین کی عمارت اِلٰہ کے صحیح مفہوم پر استوار ہوتی ہے۔ اس کے معنی ہیں، صاحبِ اقتدار۔ حاکمِ مطلق۔ واحد حکمران (اسی سے اللہ ہے۔ اور الٰہین کے معنی ہیں دو الٰہ)۔ یہ مفہوم اس نے خود ہی واضح کردیا۔ پہلے کہا کہ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۝ (۱۱۲/۱) اے رسولؐ! اس حقیقتِ کبریٰ کا اعلان کردو کہ حقِ حکومت صرف اللہ کو حاصل ہے۔ اور اس کی وضاحت میں کہہ دیا کہ لَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖٓ اَحَدًا ...... (۱۸/۲۶) وہ اپنے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ اس میں "اَحَدًا" کا لفظ بڑا اہم ہے۔ یعنی اس میں کسی کی بھی استثنا نہیں۔ خدا کے سوا کسی کو حقِ حکومت حاصل نہیں —— کسے باشد!

مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَہُ اللّٰہُ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّۃَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ ...... (۳/۷۹)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں۔ خواہ وہ ضابطہ، قوانین کا حامل ہو۔ خواہ اس کے سپرد انتظامیہ ہو۔ حتیٰ کہ وہ نبی بھی کیوں نہ ہو، اسے اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ سے ورے میرے محکوم بن جاؤ۔

اگر کوئی ایسا کہے گا۔ یا ایسا سمجھے گا تو وہ شرک کا مرتکب ہوگا۔

لہٰذا، صرف خدا کے احکام کی اطاعت کرنا توحید ہے۔ اور اس کے ساتھ کسی اور کے احکام کی اطاعت کرنا شرک ہے۔ رسولؐ بھی، اپنی امت سے خدا کے احکام کی اطاعت کراتا تھا۔ اپنے احکامات کی نہیں، کیونکہ ایسا کرنا شرک ہو جاتا۔ لَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖۤ اَحَدًا ...... پر اس کا ایمان محکم ہوتا تھا، اور اس پر عمل کرنا اور کرانا اس کا دین۔

لیکن جب اسلام کو دوسری پٹڑی پر ڈال دیا گیا تو اِلٰہ کے معنی ہو گئے "وہ جس کی پرستش کی جائے"۔ محکومیت کی جگہ پرستش کے لفظ نے دین کا سارا نظام الٹ پلٹ کر کے رکھ دیا۔ اب "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کے معنی ہو گئے۔ "خدا کے سوا کوئی پرستش کے قابل نہیں"۔ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ کے معنی ہو گئے پرستش صرف ایک خدا کی جائز ہے۔ مفہوم کی اس تبدیلی سے توحید کے معنی ہو گئے صرف خدا کی پرستش کرنا، اور شرک کے معنی ہو گئے بت پرستی۔ اور چونکہ مسلمان بت پرستی نہیں کرتے اس لئے ان کے توحید پرست ہونے میں شبہ ہی نہ رہا۔ اب ہمارے ہاں شرک اور توحید کی فرقہ وارانہ بحثوں کا موضوع ہوتا ہے، قبروں پر جانا۔ مُردوں سے دعائیں مانگنا۔ مزاروں پر چراغاں کرنا۔ عرس کرنا۔ نذر نیاز دینا۔ یہ شرک ہے۔ جو ایسا نہ کریں وہ مؤحد ہیں! یہ سوال ہی نہیں کہ محکومیت کس کی اختیار کی جا رہی ہے؛ اطاعت کس کے احکام کی کی جاتی ہے!

اس تمہید کے بعد آگے بڑھیئے۔ قرآن نے کہا ہے کہ

وَھُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰہٌ وَّفِی الْاَرْضِ اِلٰہٌ ...... (۴۳/۸۴)

خارجی کائنات میں بھی اقتدار اسی کا ہے اور انسان کی ارضی زندگی میں بھی اسی کا۔

اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے جو اپنے دائرۂ اقتدار کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس میں بھی ایک اہم حقیقت مضمر ہے۔ خارجی کائنات جن قوانینِ فطرت کے مطابق سرگرمِ عمل ہے، وہ کسی انسان کے وضع کردہ نہیں۔ خدا ہی کے متعین فرمودہ ہیں۔ لیکن (وہ کہتا ہے کہ) انسانوں کی کیفیت یہ ہے کہ یہ خارجی کائنات میں تو اس کے قوانین کا اعتراف کرتے ہیں لیکن اپنی (ارضی) زندگی کے لئے اور الٰہ تجویز اور اختیار کر لیتے ہیں۔ عصرِ حاضر کے محققین ہی کی یہ کیفیت نہیں کہ وہ قوانینِ فطرت کی محکمیت اور صداقت پر سر دھنتے ہیں۔ زمانہ نزولِ قرآن کے دانشوروں کی بھی یہی کیفیت تھی۔ اس حقیقت کو قرآنِ کریم نے متعدد مقامات میں دھرایا ہے۔ (مثلاً) سورۂ العنکبوت میں ہے:-

> اگر ان سے پوچھو کہ، کہ ارض و سماوات کو کس نے پیدا کیا ہے اور چاند اور سورج کس کے قانون کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں تو یہ اقرار کریں گے کہ اللہ ہی نے ایسا کر رکھا ہے۔
>
> ...... یا ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو بادلوں سے مینہ برساتا اور پھر اس سے زمینِ مردہ کو از سرِ نو زندگی عطا کرتا ہے۔ تو یہ اس کے جواب میں کہیں گے کہ یہ سب کچھ خدا ہی کرتا ہے۔ (۲۹/۶۱–۶۳) نیز (۲۳/۸۴–۸۸) نیز (۳۹/۳۸) نیز (۴۳/۹)۔

ان کے ان اعترافات کے بعد وہ ان سے کہتا ہے کہ جب تم کائنات کی وحدت کے قائل ہو۔ اور اس کے

بھی معترف ہو کہ ان میں خدا ہی کے قوانین کارفرما ہیں تو پھر اپنی ارضی زندگی کو اس سے الگ کس طرح کر سکتے ہو! جس طرح اس کے قوانین خارجی کائنات میں کارفرما ہیں اسی طرح انہیں تمہاری ارضی زندگی میں بھی نافذ العمل ہونا چاہیئے۔ لیکن ان کی حالت یہ ہے کہ

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ۝ (۲۱/۲۱)

یہ اپنی ارضی زندگی کے لئے اور آلہ اختیار کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ

زندگی کو انہی کے قوانین اور پروگراموں کے مطابق پھیلنا اور آگے بڑھنا چاہیئے۔

اور اس کی تائید میں بدیہی دلیل یہ دی کہ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا..... (۲۱/۲۲) اگر کائنات میں ایک آلہ کے بجائے بہت سے آلہ ہوں، جن کے اپنے اپنے قوانین نافذ العمل ہوں، تو کائنات کا سارا سلسلہ تہس نہس ہو جائے۔"

یہاں تک یہ حقیقت ہمارے سامنے آئی کہ اگر (۱) خدا کو محض پرستش کی شے تسلیم کر لیا جائے۔ یا (۲) اس کے کائناتی قوانین کی حقانیت کا اعتراف کر لیا جائے، لیکن انسانی زندگی کے لئے انسانوں کے خود ساختہ قوانین تسلیم کئے جائیں، تو یہ وہ نظام ہوگا جسے آجکل کی اصطلاح میں سیکولرازم کہا جاتا ہے۔ سیکولرازم میں تینوں گروہ شامل ہو جاتے ہیں۔ یعنی (۱) خدا کی ہستی ہی کے منکر۔ (۲) اس کے وجود کے تو معترف لیکن اس کا دائرۂ اقتدار صرف خارجی کائنات تک محدود ماننے والے۔ اور (۳) خدا کے قائل لیکن اسے صرف ایسی ہستی سمجھنے والے جس کی پرستش کی جائے۔

انسانی زندگی میں یہ تینوں گروہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے قائل ہوتے ہیں۔ اگر یہ اس زندگی میں خدا کے قوانین کو بالکل شامل نہیں کرتے تو انہیں کافر کہا جائے گا، اور اگر خدا کے قوانین کے ساتھ انسانوں کے خود ساختہ قوانین بھی شامل کرتے ہیں تو مشرک کہلائیں گے کیونکہ یہ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا..... کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ ہم (مسلمانوں) کا شمار اسی زمرہ میں ہوتا ہے۔ ہم بعض احکام خدا کے مانتے ہیں اور (ان کے ساتھ) بعض انسانوں کے وضع کردہ۔ اس طرح ہم اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ کے عملی پیروکار ہیں۔ واضح رہے کہ خدا نے کہا تھا کہ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا..... وہ اپنے حق حکومت میں کسی کو بھی شریک نہیں کرتا۔ اس لئے احکام شریعت وضع کرنے والے کوئی بھی ہوں، خدا انہیں اپنا شریک قرار دیتا ہے۔ انہی کے متعلق وہ کہتا ہے کہ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ..... (۴۲/۲۱) "کیا ان لوگوں نے خدا کے شریک بنا رکھے ہیں جو ان کے لئے احکام شریعت وضع کرتے ہیں، حالانکہ خدا نے کسی کو اس کی اجازت نہیں دی"۔ یہ کون ہیں جو احکام شریعت وضع کر کے خدا کے حق حکومت میں شریک ہو جاتے ہیں؟ فرمایا: یہ علماء و مشائخ ہیں۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ..... (۹/۳۱)۔ ان احبار و رہبان (فقہاء و مشائخ) کی عقیدت ان کے دلوں میں اس قدر اہمیت اختیار کر لیتی ہے کہ اگر انہیں خدا کا ہمسر قرار نہ دیا جائے تو یہ سخت برہم ہو جاتے ہیں۔

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ (۳۹/۴۵)

جب ان کے سامنے خدائے واحد کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دلوں میں سخت نفرت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن جب اس کے ماسوا (ان کے احبار و رہبان کا) ذکر کیا جاتا ہے تو یہ بہت خوش ہوتے ہیں۔

آپ ان کی محفلوں اور مجلسوں، مکتبوں اور دارالعلوموں میں جا کر دیکھئے۔ خدا کا نام تو محض برائے وزنِ بیت (یا تبرکاً) لیا جائے گا۔ تمام تذکرے انہی علماء اور فقہا کے کئے جائیں گے۔ آپ ان کی احکام شریعت کی کتابوں کو دیکھئے۔ دس دس، بیس بیس (بلکہ ان سے بھی زیادہ) ضخیم جلدوں پر مشتمل لیکن سب انہی فقہا حضرات کے احکام و فتاویٰ پر مبنی۔ قرآن کے متعلق یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مجمل اور نامکمل ہے۔ اس کی تکمیل انہی احکامِ شریعت سے ہوتی ہے۔ ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ..... (۴۰/۱۲) "یہی وجہ ہے کہ جب انہیں خدائے واحد و لاشریک کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو یہ اس سے انکار کرتے ہیں۔ ایمان اس وقت لاتے ہیں جب اس کے ساتھ ان (فقہا اور علماء) کو بھی شریک کیا جائے۔"

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ یاد رکھو ..... فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ۝ (۴۰/۱۲) "احکام صادر کرنے کا حق اور اختیار صرف خدا کو حاصل ہے جو سب پر غالب اور کبریائی کا سزاوار ہے۔ اس میں کسی اور کو شامل کر لینا شرک ہے ــــ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا۔"

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، احکامِ خداوندی میں انسانوں کے خود ساختہ احکام شریعت کو شامل کر لینے سے ہم عملاً اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ (دو خداؤں) کے پیروکار ہو رہے ہیں۔ اس کی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ لیکن ہم یہاں چند ایک پر اکتفا کرتے ہیں:۔

۱۔ خدائے واحد کے احکام

(۱) زانی مرد اور عورت کی سزا سو دُرّے ہے۔

(۲) مرنے والا، اپنے پورے ترکہ کے متعلق جس کے حق میں جی چاہے وصیت کرے یہ حکم خداوندی ہے اور تمام مومنین پر فرض۔

(۳) دادا کے ترکہ میں یتیم پوتے کو حق وراثت حاصل ہے۔

۲ شرکاء کے احکام

(۱) غیر شادی شدہ زانی اور زانیہ کی سزا بے شک سو دُرّے ہے لیکن شادی شدہ کی سزا سنگسار ہے۔

(۲) وصیت صرف ایک تہائی مال کے متعلق کی جا سکتی ہے اور وہ بھی وارثان کے حق میں نہیں۔

(۳) یتیم پوتا محروم رہتا ہے۔

خدائے واحد کے احکام	۲۔ ہمسٹد کار کے احکام
(۴) قتلِ عمد کی سزا موت ہے۔	(۴) قتلِ عمد میں بھی خون بہا لیا جا سکتا ہے۔
(۵) شہادت کے معاملہ میں مردوں اور عورتوں میں کوئی فرق نہیں	(۵) فوجداری مقدمات میں عورتوں کی شہادت لی ہی نہیں جا سکتی۔ دیوانی مقدمات میں دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر تسلیم کی جاتی ہے۔
(۶) خون بہا (دیت) مرد اور عورت کی یکساں ہے	(۶) عورت کی دیت مرد سے نصف ہے۔

———(٠)———

فقہا کے قوانین سازی کے حق کا سوال ہمارے ہاں شروع سے متنازعہ فیہ چلا آتا ہے۔ اہلِ حدیث حضرات ان کے اس حق کو تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن جہاں تک اطاعتِ رسولؐ کا تعلق ہے، اسے (بالواسطہ یا بلا واسطہ) متفق علیہ کہا جاتا ہے۔ اور یہی وہ سوال ہے جس کے صحیح طور پر نہ سمجھنے سے اُمّت میں اس قدر اختلافات، تفرقات، اور الجھاؤ پیدا ہوتے چلے آ رہے ہیں اور کوئی حکومت کوئی ایسا ضابطہ، قوانین مرتب نہیں کر سکتی جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ اگر اس بنیادی نکتہ کو قرآنی روشنی میں سمجھ لیا جائے تو یہ ساری اُلجھنیں دُور ہو جاتی ہیں۔

(۱) سب سے پہلے تو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ جب خدا نے کہا ہے کہ لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا۔ تو اس میں کسی کی بھی استثنےٰ نہیں کی گئی۔ اس کے معنی ہیں کہ قانون سازی (حکومت) کا حق، اور تو اور رسولؐ کو بھی حاصل نہیں تھا۔ اس کی وضاحت آیت (۳/۷۹) میں کر دی جہاں کہا کہ نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ لوگوں کو اپنے احکام کا محکوم بنائے۔ (یہ آیت پہلے درج کی جا چکی ہے)۔

(۲) حضورؐ کو خدا کا حکم تھا کہ آپ لوگوں سے احکامِ خداوندی کی اطاعت کرائیں۔ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ ...... (۵/۴۸) چنانچہ حضورؐ دوسروں سے بھی احکامِ خداوندی کی اطاعت کراتے تھے، اور خود بھی انہی احکام کا اتباع کرتے تھے۔ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ..... (۶/۵۰)

(۳) مقامِ اطمینان ہے کہ خود اہلِ حدیث حضرات بھی اب اس حقیقت کو تسلیم کرنے لگ گئے ہیں کہ قانون سازی کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ رسولؐ کو بھی نہیں۔ طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۸۱ء میں ماہنامہ محدث پر تفصیلی تبصرہ شائع ہوا تھا۔ اس میں سے دو ایک اقتباس یہاں مکرر درج کئے جاتے ہیں۔ اس میں کہا گیا تھا کہ

نظامِ خلافت میں مقتدرِ اعلیٰ خود اللہ تعالےٰ ہے۔ وہی ہر چیز کا مالک اور قانون ساز ہے۔ ملّتِ اسلامیہ اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے بنیادی قوانین اللہ تعالےٰ خود بذریعہ انبیاء انسانوں کو بتلاتا ہے ایسی قانون سازی کا اختیار کسی نبی کو بھی نہیں ہوتا۔ (صفحہ ۱۹۹)

ذرا آگے چل کر تحریر ہے :-

اسلامی نقطۂ نظر سے کسی فرد یا ادارہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خدائی قوانین میں ترمیم، تنسیخ کر سکے۔ اللہ تعالےٰ ہی قانون ساز ہے۔ کسی دوسرے کو قانون سازی کا اختیار حاصل نہیں۔ اور نہ خدا کے بنائے ہوئے قانون میں ردّوبدل کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ نبی بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ (ص ۲)

یہ اعتراضات ان تمام اُلجھنوں کو حل کر دیتے ہیں جو کتاب و سنّت کے باب میں لاینحل بن رہی ہیں۔ ہاں ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اطاعتِ رسُول کے سوال کو ذرا اور وضاحت سے بیان کر دیا جائے، اس باب میں دو آیات غور طلب ہیں، جنہیں خاص طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ..... (۴/۶۴)

رسولوں کو اس لئے بھیجا جاتا ہے کہ حکمِ خداوندی کے مطابق ان کی اطاعت کی جائے۔

(۲) مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ..... (۴/۸۰)

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔

اسلام کو اگر ایک مذہب (ہر فرد کا اپنا اپنا معاملہ) سمجھا جائے تو ان آیات سے ذہن میں اُلجھن پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ ان سے (نظر بظاہر) خدا اور رسول کی دو الگ الگ اطاعتوں کا تصوّر سامنے آتا ہے جو توحید کے خلاف ہے۔ لیکن اسلام، مذہب نہیں۔ وہ نظامِ حکومت ہے اور نظامِ حکومت کی روشنی میں ان (اور ان جیسی دیگر) آیات کا صحیح مفہوم سمجھنے میں کوئی دقّت پیش نہیں آتی۔ نہ ہی کوئی اُلجھن باقی رہتی ہیں۔

نظامِ حکومت

مثال کے طور پر کسی آئینی حکومت میں سڑک کے چوراہے پر کھڑا سپاہی جب کسی غلط راہ رو کو ہاتھ کے اشارے سے روکتا ہے تو وہ اس سے اپنے حکم کی اطاعت نہیں کراتا۔ وہ اس حکم کی اطاعت کراتا ہے جسے نافذ کرنے کے لئے اسے وہاں تعینات کیا گیا ہے۔ اسی مثال کو اوپر تک لے جائیے۔ سپاہی سے لے کر آئی جی۔ پولیس تک، سب قوانینِ مملکت کی تعمیل کرانے کے لئے مامور ہوتے ہیں۔ گورنر کی بھی یہی حیثیت ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ صدرِ مملکت کا فریضہ بھی قانونِ مملکت کی تنفیذ ہوتا ہے۔ وہ بھی اہلِ مملکت سے قانون کی اطاعت کراتا ہے۔ اپنا حکم نہیں منواتا۔ اور وہ قانون بھی خود اس کا وضع کردہ نہیں ہوتا۔ قانون ساز اتھارٹی کا مرتب کردہ ہوتا ہے۔

انسانی دُنیا میں نظامِ خداوندی یہ ہے کہ لوگ اس کے قوانین کی اطاعت کریں۔ یہ قوانین اس کتاب میں منضبط ہیں۔ لیکن کتاب کے الفاظ تو اپنی اطاعت نہیں کرا سکتے۔ ان کی اطاعت کرانے کے لئے ایک زندہ محسوس اتھارٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ اپنی کتاب کے ساتھ رسول بھیجتا ہے (تھا) رسول کا مقصد لوگوں سے کتابِ خداوندی کی اطاعت کرانا ہوتا تھا۔ اپنی اطاعت نہیں۔ یہ ہے مفہوم مندرجہ بالا آیت (۴/۶۴) کا جس میں کہا گیا ہے کہ خدا اپنی اطاعت رسولوں کے ذریعے کراتا ہے۔ جو شخص ٹریفک کے سپاہی کے حکم کی اطاعت کرتا ہے وہ اس سپاہی کی اطاعت نہیں کرتا — وہ

درحقیقت اس اتھارٹی کی اطاعت کرنا ہے جس کی اطاعت کا حکم وہ سپاہی دیتا ہے۔ اس سے اس آیۂ جلیلہ کا مفہوم (بلا تمثیل) واضح ہو جاتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔ (۴/۸۰) اسی نظامِ اطاعت کو حضور نبی اکرمؐ نے ان چند جامع الفاظ میں سمو کر فرما دیا کہ

من اطاعنی فقد اطاع اللہ۔ ومن اطاع امیری فقد اطاعنی۔ (بخاری۔ کتاب الاحکام)

جس نے میری اطاعت کی اس نے (درحقیقت میری نہیں بلکہ) اللہ کی اطاعت کی۔ اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی اطاعت کی اس نے (اس امیر کی نہیں بلکہ درحقیقت) میری اطاعت کی۔

ایک آئینی اور نظامی حکومت میں اطاعتوں کا یہی سلسلہ نیچے سے اوپر تک مسلسل چلتا ہے لیکن یہ اطاعت ان کڑیوں (عاملِ حکومت) میں سے کسی کی نہیں ہوتی۔ یہ سب قانون کی اطاعت کرتے ہیں۔ حکومتِ خداوندی میں یہ قانون خدا کا عطا فرمودہ ہوتا ہے اس لئے یہ اطاعت آخرالامر خود خدا کی اطاعت ہوتی ہے۔ اس باب میں اور تو اور خود حضور نبی اکرمؐ بھی اپنے آپ کو خدا کا عبد (محکوم) قرار دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اگر (بفرضِ محال) مجھ سے بھی اس کے حکم کی خلاف ورزی ہو جائے تو مجھ سے بھی سخت مؤاخذہ ہوگا۔

خدا کی اطاعت کرانے کے لئے محسوس زندہ اتھارٹی کی ضرورت کس قدر لاینفک ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ فرمانِ خداوندی اور ارشاداتِ نبویؐ دونوں میں "سمع اور طاعت" کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ یعنی "حکم کا سننا اور اس کی اطاعت کرنا"۔ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ..... (۵/۷) "جب تم نے کہا کہ ہم نے حکم سن لیا ہے اور ہم اس کی اطاعت کریں گے"۔ سورۃ النور میں ہے کہ "جماعتِ مومنین کا شیوہ یہ ہے کہ جب انہیں ان کے کسی معاملہ میں حکم دینے کے لئے بلایا جائے تو وہ کہتے ہیں — "سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ..... (۲۴/۵۱) "ہم نے سنا اور ہم اس کی اطاعت کریں گے"۔ ارشادِ نبویؐ ہے — لا اسلام الا بجماعۃ ولا جماعۃ الا بالامیر۔ ولا امیر الا بالسمع والطاعۃ۔ اسلام نام ہے جماعت (ہیئتِ اجتماعیہ) کا۔ اور جماعت (ہیئتِ اجتماعیہ) قائم ہوتی ہے۔ امیر (مرکزِ حکومت) سے۔ اور امیر کا ہونا اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے احکامات کو سنا جائے اور پھر ان کی تعمیل کی جائے۔

حضورؐ کے عہدِ ہمایوں میں اللہ کی اطاعت۔ رسولؐ کی اطاعت اور امیر کی اطاعت سے یہی مفہوم تھا۔ یہ الگ الگ اطاعتیں نہیں تھیں۔ یہ اطاعتِ خداوندی کا عملی طریقہ تھا۔ جب تک امت ..... کی مرکزیت کا یہ نظام قائم رہا، اس قسم کے سوال ہی پیدا نہ ہوئے کہ خدا کی اطاعت کس طرح کی جائے اور رسولؐ کی کس طرح۔ یا فقہا اور علماء کی کس طرح؟ یہ انتشار اس وقت پیدا ہوا جب امت کی مرکزیت (خلافتِ علیٰ منہاج رسالت) باقی نہ رہی۔ امام اور جماعت کا باہمی کیا تعلق ہوتا ہے، اور جماعت بلا امام کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ اس کا نقشہ کسی جمعہ کی نماز کے وقت شاہی مسجد (یا کسی اور جامع مسجد) میں جا کر دیکھئے۔ لاکھ آدمیوں کا مجمع، قطار در قطار صحنِ مسجد میں کھڑا ہے۔ قدم بقدم۔ شانہ بشانہ۔ ایسے جیسے سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو۔ سامنے ایک امام ہوتا ہے۔ اس امام کی ایک آواز پر سب جھکتے ہیں۔ سب اٹھتے ہیں۔ سب بیٹھ جاتے ہیں۔ سب دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ کوئی اختلاف نہیں۔ کوئی انتشار نہیں۔ ذرا سا تفرقہ نہیں۔ یہ نتیجہ

لہ تفصیل طلوع اسلام بابت مئی جون ۱۹۸۲ء میں دیکھئے

تھا سمع وطاعت کا۔

فرضوں کی نماز کے بعد، وہی صحنِ مسجد ہوتا ہے۔ وہی نمازی۔ اُسی قسم کی نماز۔ لیکن صحن کا نقشہ کیا ہوتا ہے؟ کوئی کھڑا ہے۔ کوئی رکوع میں ہے۔ کوئی سجدہ میں ہے۔ کوئی بیٹھا ہے۔ کوئی سلام پھیر رہا ہے۔ کوئی جوتے اٹھائے صفیں چیرتا باہر نکل رہا ہے۔

وہی صحنِ مسجد جو ابھی ابھی، کامل آہنگی و یک رنگی کا حیرت انگیز منظر تھا، اب یکسر خلفشار و انتشار کا عبرت انگیز مرقع ہے! اس کا سبب کیا ہے؟ صرف ایک امیر (مرکزِ امت) کی کمی۔ وہی سمع و طاعت کا فقدان ——— بلکہ یوں کہیئے کہ وہی سمع کا فقدان، کیونکہ طاعت تو (انفرادی طور پر) اب بھی ہو رہی تھی۔

صدیوں سے اُمّت اسی لامرکزیت کا شکار چلی آرہی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ ہیں: ؎

هنوز این چرخ نیلی کج خرام است ۔۔۔ هنوز این کاروان دور از مقام است

ز کار بے نظام او چہ گویم ۔۔۔ تو می دانی کہ ملت بے امام است! (ارمغانِ حجاز ص ۷۹)

(۱) جن لوگوں کے نزدیک مذہب ایک پیشہ ہے، ہمارا ان سے خطاب نہیں۔

(۲) جن لوگوں کے نزدیک مذہب اپنی مفاد پرستی کا ذریعہ ہے، ہمارا ان سے بھی خطاب نہیں۔

(۳) جو لوگ جہالت اور تعصب کی تاریکیوں میں اس قدر ڈوب چکے ہیں کہ وہ کسی ایسی بات کے سننے کے لئے تیار نہیں جسے وہ شریعت مانتے چلے آرہے ہیں، ہمارا ان سے بھی خطاب نہیں۔

(۴) ہمارا خطاب ہے صرف ان اربابِ قلب و نظر سے جو حقیقی اسلام کے احیاء کا جذبہ دل میں رکھتے ہیں۔ اور ہر بات کو علم و بصیرت کی روشنی میں پرکھنے کے لئے تیار ہیں۔

ان حضرات کی خدمت میں ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام کا احیاء صرف ان عناصر سے وابستہ ہے۔

(۱) حاکمیت یا اطاعت صرف کتاب اللہ کی۔ اس کے ساتھ کسی اور کی حاکمیت یا اطاعت کا ملانا شرک ہے۔

(۲) خدا کی کتاب کی اطاعت کرانے کے لئے ایک زندہ اتھارٹی کی ضرورت۔

(۳) یہ اتھارٹی، اُمّت کے باہمی مشورہ سے وجود میں آئے گی۔ ختمِ رسالت کے بعد مامورین من اللہ کا دور ختم ہو گیا۔

(۴) یہ مرکزی اتھارٹی قرآن کے احکام نافذ کرے گی جن کی تعمیل کرانا، عمالِ حکومت کا فریضہ ہوگا۔ ان کی تعمیل کے طرق و اسالیب زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ (عند الضرورت) بدلتے رہیں گے لیکن قرآنی احکام و اصول ابدی طور پر غیر متبدل ہوں گے۔

یہی وہ طریق ہے جس سے اسلام کا احیاء ہوگا اور توحید کا نقش ثبت۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو (خواہ کتنی ہی نیک نیتی سے اسلام کے احیاء کی کوششیں کیوں نہ کی جائیں) اس سے ہم اسلام سے اور دُور ہوتے چلے جائیں گے، اور ہماری حالت ویسی کی ویسی رہے گی جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ (۱۲/۱۰۶)

ان کی اکثریت ایسی ہے جو مومن کہلاتے ہوئے بھی مشرک کے مشرک رہتے ہیں۔

یاد رکھیئے! بتوں کو خدا بنا لینا اگر شرک ہے تو انسانوں کو خدا بنا لینا شرکِ عظیم! توحید: لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا ہے۔ خالص اور صرف احکامِ خداوندی کی اطاعت۔

کب ڈوبیگا سرمایہ پرستی کا سفینہ

قائدِ اعظمؒ نے فرمایا

اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ایک ایسے فتنہ انگیز، ابلیسی نظام کی رو سے، جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا، عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کرنے کا جذبہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں۔ وہاں میں نے دیکھا ہے کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے۔ اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہو گا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو انکا خدا حافظ۔ ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔

(آل انڈیا مسلم لیگ دہلی۔ ۱۹۴۳ء کے اجلاس میں تقریر)

سرمایہ داروں کا انجام

پرویز

طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۸۴ء میں پرویز صاحب کا مقالہ بعنوان "ظلم کا انجام" شائع ہوا تھا۔ اب اسی سلسلہ کی دوسری کڑی شائع کی جا رہی ہے۔

"سرمایہ داروں" کے لئے قرآنِ کریم میں دو اصطلاحات عام طور پر آتی ہیں۔

(۱) اَلْمَلَأُ ـــ (مَلَأَ ـــ یَمْلَأُ ـــ مَلْأٌ) کے بنیادی معنے ہیں، کسی چیز کو بھر دینا ـــ اس اعتبار سے اَلْمَلَأُ ان لوگوں کو کہتے ہیں جن کے گھر ضروریاتِ زندگی کی اشیاء سے بھرے ہوئے ہوں۔ جنہیں سامانِ زیبت بڑی فراوانی سے حاصل ہو۔ چونکہ، غیر خداوندی نظام میں عزّت اور سیادت کا معیار، دولت ہوتی ہے۔ اس لئے یہی لوگ قبیلہ یا قوم کے سردار بھی ہوتے تھے اس لئے تبعاً یہ لفظ (اَلْمَلَأُ) سردارانِ قوم کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا۔ لیکن اس سے بنیادی طور پر مراد سرمایہ دار طبقہ ہی تھا۔

(۲) مُتْرَفِیْنَ ـــ وہ لوگ جو عیش و آرام کی زندگی گزار رہے ہوں۔ ایسے خوشحال لوگ جن کے پاس کثرت سے دولت ہو، اور اس بناء پر وہ بڑے خود سر ہو جائیں۔ قرآنِ کریم نے مُتْرَفِیْنَ کی وضاحت خود ہی کر دی ہے جہاں کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں۔ قَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ۔ (۳۴/۳۵) جو کہتے ہیں کہ ہمارے پاس بڑی کثرت سے دولت ہے اور ہمارا قبیلہ اور جتھہ بھی بہت بڑا ہے۔ ہم جو جی میں آئے، کریں۔ ہمیں کون ہاتھ لگا سکتا ہے؟

قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ دینِ خداوندی کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ وہ آسمانی دعوتِ انقلاب کے داعیٔ اوّل حضرت نوحؑ کے تذکرہ جلیلہ کے ضمن میں کہتا ہے۔

ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف پیغامبر بنا کر بھیجا۔ اس نے اُن سے کہا کہ تم قوانینِ خداوندی کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے سوا کوئی ایسی قوت نہیں جس کی محکومی اختیار کی جائے اگر تم نے ایسا نہ کیا (اور اپنی موجودہ روش پر اڑے رہے تو) مجھے نظر آتا ہے کہ تم پر سخت تباہی آجائے گی۔ (۷/۵۹)

آپ نے پیغام دیکھ لیا۔ یہ پیغام ساری قوم کے لئے تھا۔ لیکن قوم میں سے بھڑک کر کون سا طبقہ اٹھا؟ ـــ سنئے!

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔ (۷/۶۰)

اس قوم کے دولت مند سرمایہ دار طبقہ نے کہا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ تم عجیب اُلٹے راستے پر چل رہے ہو۔ (ہمیں اس روش پر چلنے سے اس قدر مال و دولت حاصل ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ اس سے ہم پر تباہی آجائے گی)

سورۃ ھُوْدؑ میں اس اجمال کی تفصیل دی گئی ہے جہاں کہا ہے کہ

اس پر قوم کے سرمایہ دار طبقہ نے کہا کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ تم ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو۔ (اس لئے ہم کیسے مان لیں کہ تم خدا کے رسول ہو) باقی رہے یہ لوگ جو تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں تو ان کی حیثیت ہی کیا ہے؟ یہ ہم میں سے نچلے درجے کے لوگ ہیں اور یہ صاف دکھائی دے رہا ہے کہ انہوں نے تمہارا مسلک عقل و فکر کی رُو سے اختیار نہیں کیا۔ یونہی بلا سوچے سمجھے تمہارے ساتھ ہو لئے ہیں۔ ہمیں تو کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جس میں تمہیں ہمارے مقابلہ میں کوئی برتری حاصل ہو ـــــ لہٰذا، ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ تم اپنے اس دعوے میں جھوٹے ہو۔ (۱۱/۲۷)

یہاں سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ قوم کے غریب اور کمزور طبقہ نے اس دعوت پر لبیک کہا اور دولتمند اور طاقتور طبقہ نے اس کی مخالفت کی تھی۔ اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ اس دولت مند طبقہ کی طرف سے یہ مطالبہ پیش کیا گیا کہ تم ان غریب اور نادار لوگوں کو دھتکار کر نکال دو تو پھر ہم تمہاری بات سننے کے لئے آمادہ ہو سکیں گے۔ اس پر حضرت نوحؑ نے کہا کہ

تم اس پر غور کرو کہ میں جو کچھ تمہاری بھلائی کے لئے کرنا چاہتا ہوں، اس کے معاوضہ میں تم سے کوئی مال و دولت نہیں مانگتا۔ لیکن میں یہ نہیں کر سکتا کہ جو لوگ اس نظام کی صداقت پر ایمان لائے ہیں، انہیں اس لئے نکال باہر کر دوں کہ وہ غریب و نادار ہیں اور اس لئے تم انہیں ذلیل سمجھتے ہو ـــــ میں اگر تمہاری خاطر ان لوگوں کو دھتکار دوں، تو اس سے تم تو بیشک خوش ہو جاؤ گے، لیکن ذرا سوچو کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے اس جرم کی جو سزا مجھ پر وارد ہو جائے گی اس سے مجھے کون بچا سکے گا؟ ..... تم جو یہ سمجھتے ہو کہ یہ لوگ جنہیں تم اپنے معیار کے مطابق ذلیل اور حقیر خیال کرتے ہو، خدا کی نظروں میں بھی ذلیل و حقیر ہیں، اور انہیں اس کے ہاں سے کوئی خوشگواری کا سامان نہیں مل سکتا، یہ غلط ہے قانونِ خداوندی کی رُو سے معیارِ عزت و تکریم اور استحقاقِ خیر و برکت انسان کے جوہر ذاتی ہیں۔ اس کی نگاہ کسی کے مال و دولت پر نہیں، بلکہ انسان کے دل پر ہوتی ہے۔ اگر میں تمہاری بات مان لوں، تو میں بھی تمہارے ہی جیسا ظالم ہو جاؤں۔ (۱۱/۳۱ - ۲۹)

آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے اس کا جواب کیا دیا؟ وہی، جو ہر ایسا شخص دیا کرتا ہے جو دولت و قوت کے نشہ میں بدمست ہو۔ انہوں نے کہا:۔

اے نوحؑ! ہم نے تم سے یونہی ذرا سی بات کی تھی اور تم ہو کہ آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے ہو۔ ہم تمہاری کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں۔ تم جس تباہی کی دھمکی دے رہے ہو اسے لے آؤ ـــــ ہم دیکھیں کہ وہ ہمارا کیا بگاڑ لیتی ہے۔ (۱۱/۳۲)

سورۃ الشعراء میں ہے کہ ان امرائے قوم نے کہا کہ

اے نوحؑ! تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا ہم تمہیں اپنا لیڈر تسلیم کر لیں اور اس طرح تمہاری اس جماعت میں شامل ہو جائیں جس میں سوسائٹی کے وہ لوگ شامل ہیں جو نہایت پست اور ذلیل ہیں اور ادنیٰ ادنیٰ کام کاج کرتے ہیں (وہ مزدور اور محنت کش ہیں۔ کیا ہم اس جماعت میں شامل ہو کر ان لوگوں کو اپنا ہمسر بنا لیں؟ یہ کیسے ممکن ہے؟) (۲۶/۱۱۱)

اس پر حضرت نوحؑ نے کہا کہ مجھے اس سے غرض نہیں کہ میں معلوم کروں کہ یہ لوگ کیا کام کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ لوگ صداقت کو کس قدر تسلیم کرتے ہیں اور اس نظام کے قیام کے لئے کیا کام ہیں، جسے میں پیش کرتا ہوں۔ یہی ہمارے ہاں قدر و قیمت کے پیمانے ہیں۔ میرے نزدیک یہ غریب وفادار لوگ جو اس نظام کے قیام کے لئے میرے رفیقِ کار بنے ہیں، ان سردارانِ قوم سے کہیں زیادہ واجب الاحترام ہیں جو اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ (۲۶/۱۱۲ - ۱۱۱)

سورۃ المؤمنون میں ہے کہ ان رؤسائے قوم نے اپنے طبقہ کے دیگر افراد سے کہا کہ یاد رکھو! اس شخص سے بڑا محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ تو ہم پر بالادستی (SUPERIORITY) حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ تم پر اپنا نظام مسلط کر دے۔ اس کا (معاذ اللہ) دماغ چل گیا ہے۔ یہ پاگل ہو گیا ہے جو کہتا ہے کہ امیر اور غریب سب ایک جیسے ہیں۔ تم چند دنوں تک انتظار کرو۔ اس کی یہ تحریک خود بخود ناکام ہو جائے گی۔ (۲۳/۲۴)

لیکن، آخر الامر ہوا یہ کہ انہی نادار اور غریبوں کی جماعت محفوظ رہی، اور وہ جو سامانِ فضیلت کی فراوانیوں سے اس قدر بدمست ہو رہے تھے، غرق ہو گئے۔

حق و باطل کی کشمکش کی اس پہلی کڑی کو بیان کرنے کے بعد، قرآن کریم کہتا ہے کہ اس سرگزشت میں تمہارے لئے، ہمارے قانونِ مکافات کی ہمہ گیری کی نشانیاں ہیں۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہم غلط نظام کو کس طرح الٹا کر رکھ دیا کرتے ہیں۔ (۲۳/۳۰)

قومِ نوحؑ کے بعد، ہمارے سامنے قومِ عادؑ کا تذکرہ آتا ہے جس کی طرف حضرت ہودؑ مبعوث ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی قوم کے سامنے اسی انقلاب آفرین نظامِ زندگی (دین) کو پیش کیا جسے حضرت نوحؑ نے پیش کیا تھا۔ اس کے جواب میں قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ۔ اس قوم کے بڑے بڑے سرغنوں نے جنہیں مال و دولت کی فراوانی حاصل تھی، اور جو اس دعوت کی مخالفت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ کہا کہ

نہیں تو ایسا نظر آتا ہے کہ تم عقل و ہوش کھو بیٹھے ہو۔ تم جو کہتے ہو کہ ہماری روش ہمیں تباہیوں کی طرف لے جا رہی ہے، یہ سب جھوٹ ہے۔ (۲۳ نیز ۲۲/۲۳)

اس قوم کو رزق کی کس قدر فراوانیاں حاصل تھیں اور اس کے بل بوتے پر انہوں نے خلقِ خدا پر کس طرح گوشۂ عافیت تنگ کر رکھا تھا، اس کے ضمن میں قرآنِ کریم ہے کہ

حضرت ہودؑ نے ان سے کہا کہ ذرا دیکھو کہ تمہیں اس وقت سامانِ زیست کس قدر فراواں حاصل ہے۔ مال مویشی کی کثرت، افرادِ قبیلہ کی بہتات، لہلہاتے باغ، ان کی سیرابی کے لئے رواں دواں چشمے (یہ سب خدا کی عطا کردہ ذرائع رزق ہیں جسے اس نے تمام انسانوں کی پرورش کے لئے پیدا کیا تھا، لیکن تم اسے کمزوروں اور ناداروں پر ظلم کرنے کے لئے استعمال کرتے ہو۔ تمہاری حالت یہ ہے کہ تم اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے اونچی اونچی پہاڑیوں پر اس قسم کے میموریل بناتے ہو جن کا کوئی مصرف نہیں۔ ان سے بھلا نوعِ انسانی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ اور تم بڑے بڑے ساز و سامان (اور اسلحہ وغیرہ) بناتے ہو۔ اس لئے نہیں کہ اس سے ظلم کی روک تھام کرو۔ بلکہ اس لئے کہ کمزوروں پر تمہارے آہنی پنجے کی گرفت ڈھیلی نہ ہونے پائے اور تمہارا غلبہ و تسلط ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم رہے۔ تم اس روش کو چھوڑ دو اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ (۲۶/۱۳۵ - ۱۲۸)

اس طبقہ کی طرف سے اس کا ردِعمل کیا تھا؟ قرآن بتاتا ہے کہ

(انہوں نے یہ سب کچھ سنا اور نہایت طنز اور حقارت سے کہا کہ آپ کے اس وعظ کا شکریہ! ہمیں اس کی ضرورت نہیں) ہمارے لئے تمہارا وعظ و نصیحت کرنا، نہ کرنا، برابر ہے (خدا، اور اس کا قانونِ مکافات، تباہیوں اور بربادیوں کا عذاب، جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔ یہ سب) اگلے زمانے کے لوگوں کے من گھڑت افسانے ہیں۔ ہم پر کوئی تباہی نہیں آسکتی۔ (۲۶/۱۳۹ - ۱۳۶)

وہ کوئی جاہل اور گنوار قوم نہیں تھی۔ ان کے پاس :-

سننے کے لئے کان، دیکھنے کے لئے آنکھیں اور سمجھنے سوچنے کے لئے دل و دماغ تھے۔ لیکن جب انہوں نے قوانینِ خداوندی کی اس طرح مخالفت کی تو ان کی سماعت و بصارت و قلب ان کے کسی کام نہ آسکے۔ ان کا علم و عقل انہیں اس تباہی سے نہ بچا سکا جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ (۴۶/۲۶)

حضرت ہودؑ نے ان سے کہا تھا کہ " اگر تم نے اس غلط روش کو نہ چھوڑا، تو تمہاری جگہ ایک اور قوم آجائے گی جس کا نظام، تمہارے نظام کی ضد ہوگا"۔ (۱۱/۵۷) یہ ہے خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے، قوموں کے استبدال و استخلاف (SUCCESSION AND SUBSTITUTION) کا اصول جس کی رو سے وہ قوم جو غلط نظامِ حیات کی حامل ہو، تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جگہ وہ

قوم لے لیتی ہے جو صحیح نظام کی حامل ہو۔

قومِ عاد کے بعد ہمارے سامنے قومِ ثمود آتی ہے جس کی طرف حضرت صالحؑ دعوتِ انقلاب لے کر آئے تھے۔ وہ زمانہ گلہ بانی کا تھا۔ معیشت کا مدار مویشی تھے۔ اور ان مویشیوں کی زندگی کا مدار چراگاہوں اور پانی کے چشموں پر تھا۔ اس قوم کے بالادست طبقہ نے ان ذرائع پر ورش کو اپنی ملکیت میں لے رکھا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کمزوروں کے جانوروں کو ان میں گھسنے نہیں دیا جاتا تھا۔ ان کی پانی کی باری ہی نہیں آتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ خاندانی اعتبار سے حضرت صالحؑ کا تعلق بھی اسی طبقہ سے تھا۔ لیکن انہوں نے ان کی اس باطل روش کے خلاف اعلانِ انقلاب کیا تو انہوں نے کہا کہ

یٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَا۔ (۱۱/۶۲)

اے صالحؑ! ہماری تو تمہارے ساتھ بڑی بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ تم تو ہماری اُمیدوں کے مرکز تھے۔ تم یہ کیا کہنے لگ گئے؟

یہ کہنے والے کون تھے؟ وہی اَلْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ۔ (۷/۷۵) اس کی قوم کا وہ دولتمند طبقہ جس نے دھاندلی مچا رکھی تھی۔

اور حضرت ہودؑ نے ان سے کیا کہا تھا جس پر یہ ان کی طرف سے اس قدر مایوس ہو کر بگڑ بیٹھے تھے؟ ـــــ انہوں نے کہا تھا کہ

دیکھو! خدا نے تمہیں اس ملک میں کس قدر تمکن عطا کیا ہے۔ تم میدانوں میں محلات تعمیر کرتے ہو۔ پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں مکانات بناتے ہو۔ تم خدا کی ان نعمتوں کو اپنے پیشِ نظر رکھو اور ملک میں فساد مت برپا کرو۔ (۷/۷۴)

پھر انہوں نے کہا۔ کہ

ذرا سوچو کہ اگر تم نے اپنا معاشی نظام اسی قسم کا رکھا جس سے معاشرہ میں اس قدر ناہمواریاں پیدا ہو جائیں۔ تو کیا یہ آسائشیں اور فارغ البالیاں اسی طرح رہنے دی جائیں گی۔ کیا تم ان لہلہاتے باغات اور چشموں میں، ان زرخیز زمینوں میں۔ ان نخلستانوں میں جہاں درختوں پر پھلوں کے نرم اور خوشگوار خوشے تہ بہ تہ لٹک رہے ہیں۔ اور ان قلعہ نما محلوں میں جنہیں تم پہاڑوں کو تراش کر بڑی صنعت کاری سے بناتے ہو اور پھر اتراتے ہو کہ یہاں تمہارا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا ـــــ اسی طرح رہو گے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس غلط معاشی نظام کے باوجود یہ تمام خوشحالیاں علےٰ حالہٖ قائم رہیں گی! (۲۶/۱۴۶-۱۴۹)

اس پر انہوں نے وہی حربہ اختیار کیا جو ابلیسی سیاست کے علمبردار اختیار کیا کرتے ہیں۔ یعنے انہوں نے حضرت ہودؑ سے تو کچھ نہ کہا، کیونکہ ان کا خاندان بڑا تھا۔ لیکن ان کے متبعین کو جو غریب لوگ، اور کمزوروں پر مشتمل تھے، دھمکانا شروع کر دیا۔ سورۂ اعراف میں ہے:-

اس پر اُس قوم کے سرکش اکابرین نے، جنہیں مال و دولت کی فراوانی نے بدمست کر رکھا تھا، جماعتِ مومنین سے کہا ــــ اور یہ وہ لوگ تھے جنہیں وہ اکابرین، ان کے افلاس کی وجہ سے بہت کمزور اور حقیر سمجھتے تھے ــــ کہ کیا تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ صالحؑ خدا کا رسول ہے؟ اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہم اسے ایسا تسلیم نہیں کرتے۔ (اس لئے تم خود سمجھ لو کہ جس روش کو ہم صحیح نہیں سمجھتے اس پر چلنے سے تمہارا کیا حشر ہوگا)۔
(۷/۷۵-۷۶)

جب یہ حربہ بھی کارگر نہ ہوا تو انہوں نے حضرت صالحؑ سے مصالحت کی کوشش کی۔ اور ان سے پوچھا کہ آپ چاہتے کیا ہیں؟ انہوں نے کہا کہ میں اس کے سوا اور کیا چاہتا ہوں کہ خدا نے جو رزق تمام انسانوں کی پرورش کے لئے پیدا کیا ہے، اسے تمام انسانوں کے لئے کھلا رکھا جائے۔ ہر ایک کے مویشی چراگاہوں میں چریں اور اپنی اپنی باری چشموں سے پانی پئیں۔ اس پر وہ راضی ہو گئے تو حضرت صالحؑ نے کہا کہ مجھے اس کا عملی ثبوت ملنا چاہیئے کہ تم اس معاہدہ پر کاربند رہتے ہو۔ اس وقت تمہاری حالت یہ ہے کہ تم نے خدا کی زمین پر لکیریں کھینچ کر ــــ یہ میری اور یہ تیری ــــ کی تفریق پیدا کر رکھی ہے۔ اور "میری زمین میں میرے مویشی چر سکتے ہیں اور تیری زمین میں تیرے" حالانکہ نہ زمین میری اور تیری ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس مقصد کے لئے میرے اور تیرے مویشیوں کی تفریق ــــ یہ ایک اونٹنی ہے جسے یوں سمجھو کہ یہ نہ میری ہے، نہ تیری ــــ اور اسے میں چراگاہ میں چھوڑتا ہوں:۔

هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ ــــ تَاْكُلْ فِیْۤ اَرْضِ اللّٰهِ۔ (۷/۷۳)

یہ خدا کی اونٹنی ہے، جو خدا کی زمین میں چرے گی۔

اگر تم نے اسے اس طرح چرنے دیا، تو سمجھ لیا جائے گا کہ تم میرے تجویز کردہ معاشی نظام پر کاربند رہو گے۔ لیکن اگر تم نے اسے اس سے روکا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اس تبدیلی کو گوارا نہیں کر سکتے اور اپنی روش پر قائم رہنا چاہتے ہو۔

قوم کے سرمایہ داروں نے ماننے کو تو اسے مان لیا لیکن جب دیکھا کہ غریبوں کے مویشی اور ان کے جانور سب برابر کر دیئے گئے ہیں تو ان کے سینوں میں حسد و رقابت کی آگ بھڑک اٹھی ــــ فَعَقَرُوْهَا۔ (۲۶/۱۵۷) انہوں نے غم و غصہ سے پاگل ہو کر اس اونٹنی کو مار ڈالا۔ (نیز ۵۴/۲۹، ۹۱/۱۴) ــــ اور اپنے اسی سابقہ معاشی نظام کی طرف لوٹ گئے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ فَدَمْدَمَ عَلَیْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا۔ (۹۱/۱۴)۔ خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ان پر روڈ رولر (ROAD ROLLER) کی طرح پھر گیا اور انہیں زمین کی سطح کے ساتھ ہموار کر کے رکھ دیا۔

خدا رے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

اسی طرح قومِ مدین کی طرف، حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے۔ اس قوم کی معیشت گلہ بانی بھی تھی اور

کاروباری بھی۔ ان کے زرعی نظام کی کیفیت کیا تھی؟ اس کا اندازہ حضرت موسیٰؑ کے اس واقعہ سے لگائیے جو اس بستی سے باہر پاؤں پہ پیش آیا:۔

حضرت موسیٰؑ جب مصر سے بھاگ کر مدین کے قریب آئے تو وہ ستانے کے لئے ایک چشمے کے قریب درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ چشمے پر مویشی غٹا غٹ پانی پی رہے ہیں لیکن دو لڑکیاں ہیں جو پاؤں سے دور کھڑی ہیں۔ ان کے مویشی پیاس کے مارے قابو سے باہر ہوئے جا رہے ہیں لیکن وہ انہیں چشمے کی طرف جانے سے روکتی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کو اس پہ تعجب ہوا کہ وہ انہیں پانی کی طرف جانے سے روکتی کیوں ہیں؟ چنانچہ ان کے دریافت کرنے پر لڑکیوں نے جواب دیا کہ

جب تک یہ چرواہے اپنی بکریوں کو پانی پلا کر نہ لے جائیں، ہم اپنی بکریوں کو پانی نہیں پلا سکتیں۔ اس لئے کہ یہ لوگ بڑے بڑے جتھوں کے مالک اور صاحب قوت ہیں۔ اور ہمارے ہاں کوئی آدمی نہیں۔ صرف ایک باپ ہے جو بہت بوڑھا ہے۔ (۲۸/۲۳)

حضرت موسیٰؑ نے دل میں کہا کہ ——— بہر زمینے کہ رفتیم آسماں پیداست ——— مصر سے بھاگا تھا کہ وہاں فرعونیوں کی بالادست قوم نے بنی اسرائیل پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ یہاں پہنچا تو معاملہ وہاں سے بھی زیادہ الم انگیز نظر آیا۔ وہاں ایک قوم دوسری قوم کو تنگ کرتی تھی۔ یہاں ایک ہی قوم کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو پانی کے چشمے کے قریب آنے نہیں دیتا۔ یہ جی میں کہا اور اٹھ کر ان غریب لڑکیوں کی بکریوں کو خود پانی پلا دیا اور پھر درخت کے نیچے آکر بیٹھ گئے۔ اور گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ (۲۸/۲۴) کہ

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟

یہ تھی قوم مدین کی زرعی معیشت کی حالت۔ جہاں تک ان کی کاروباری زندگی کا تعلق ہے، ان کی کیفیت وہی تھی جو ہر سرمایہ دار قوم کی ہوتی ہے۔ حضرت شعیبؑ نے ان کی یہ حالت دیکھی تو ان سے کہا کہ

تمہیں چاہیئے کہ اپنے معاشی نظام میں عدل برتو۔ ماپ تول کو پورا رکھو۔ لوگوں کے حقوق و واجبات میں کمی نہ کرو۔ اور معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہو جانے کے بعد ناہمواریاں مت پیدا کرو۔ یہ سب کچھ تمہارے ہی بھلے کے لئے ہے، اگر تم یقین کرو تو۔

دیکھو! ایسا نہ کرو کہ زندگی کے ہر راستے پہ راہزن بن کر بیٹھ جاؤ اور جو لوگ صحیح نظام خداوندی کے قیام کے لئے اٹھیں، انہیں دھمکیاں دے دے کر اس راستے سے روکو اور انسانیت کی راہ میں پیچ و خم پیدا کرنے کے درپئے رہو (۷/۸۵-۸۶) نیز (۲۶/۱۸۱-۱۸۴)۔

شروع شروع میں انہوں نے، حضرت شعیبؑ کی اس دعوت کو (SERIOUSLY) نہ لیا۔ اور ان سے صرف اتنا کہ ——— اِنَّمَآ اَنۡتَ مِنَ الۡمُسَحَّرِیۡنَ۔ (۲۶/۱۸۵) "ہمیں ایسا نظر آتا ہے کہ تو بھی انہی میں سے ہے، جو اس فریب میں مبتلا ہو کر، کہ خدا ان سے باتیں کرتا ہے، قوم کے مصلح بننے کی کوشش کیا کرتے ہیں"۔ حضرت شعیبؑ نے ان سے کہا کہ باقی معاملات تو بعد میں دیکھے جائیں گے، تم اس وقت اتنا تو کرو کہ میری صلوٰۃ میں مداخلت نہ کرو۔ انہوں نے اپنے جی میں سمجھا کہ یہ اپنے طور پہ پوجا پاٹ کرنا چاہتا ہے سو اسے ایسا کرنے دو۔ اس سے ہمارا کیا بگڑتا ہے چنانچہ

انہوں نے کہدیا، کہ ہم تمہاری صلوٰۃ میں مزاحمت نہیں کریں گے لیکن انہوں نے دیکھا کہ شعیبؑ کے نزدیک "صلوٰۃ" سے مفہوم پرستش نہیں، کچھ اور ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس سے کہا کہ

يٰشُعَيْبُ - اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (۱۱/۸۷)۔

(تم جو کچھ کہتے تھے، اس سے ہم نے یہ سمجھا تھا کہ تم صرف پوجا پاٹ کا کوئی اپنا طریقہ لے کر آئے ہو اس لئے ہم نے تجھ سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ ہمارے ذہن میں تھا کہ ہم اپنے طریق پر پوجا پاٹ کرتے رہیں گے تم اپنے طریق پر کرتے رہو۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ معاملہ پوجا پاٹ کا نہیں۔ تیری صلوٰۃ پرستش نہیں، یہ تو ہماری روزمرہ کی عملی زندگی کے ان شعبوں میں دخیل ہو رہی ہے جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں، کیا تیری صلوٰۃ تجھ سے یہ کہتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے اسلاف کرتے چلے آرہے ہیں۔ نیز یہ کہ ہم نہ اپنے طریق کے مطابق مال و دولت حاصل کریں، نہ ہی اسے اپنی مرضی کے مطابق صرف کریں۔ ہماری معاشی زندگی تمہاری مرضی کے تابع چلے ـــــ یہ انوکھی سی "صلوٰۃ" ہے!

(ضمناً) آپ نے غور فرمایا کہ "مذہب" میں صلوٰۃ (نماز) کا کیا مفہوم ہوتا ہے۔ اور "دین" میں صلوٰۃ کا مقصود کیا؟ دین کی رُو سے صلوٰۃ کا نظام، قوم کے معاشی نظام کو بھی اپنے دائرے کے اندر لئے ہوتا ہے۔ اسی نظام کے قائم کرنے کا حکم قرآن نے دیا تھا۔

بہرحال، جب قوم نے دیکھا کہ معاملہ آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے اور یہ تحریک ہی کچھ اور ہے تو انہوں نے دھمکیاں دینی شروع کیں ـــــ قَالَ الْمَلَاُ۔

اس قوم کے سرمایہ دار طبقہ نے، جو قوت کے نشہ میں بدمست ہو رہے تھے، کہا کہ اے شعیبؑ! ان باتوں میں سے ایک ضرور ہوگی ـــــ یا تو تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو پھر سے وہی قدیم مسلک اختیار کرنا ہوگا جسے چھوڑ کر وہ تمہارے ساتھ ہو لئے ہیں، اور یا پھر ہم تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو بستی سے نکال دیں گے۔ اب تم خود سوچ لو کہ تمہیں کیا کرنا ہے (۷/۸۸)۔

قوم نے اپنی روش کو نہ چھوڑا اور اپنے غلط نظام کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گئی (۲۹/۳۷)

اور داستانِ، صاحبِ ضربِ کلیم، حضرت موسیٰؑ تو ہے ہی ـــــ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری تینوں کے خلاف۔ بیک وقت دعوتِ مبارزت۔ فرعون، ملوکیت کے استبداد کا مجسمہ ـــــ ہامان، مذہبی پیشوائیت کی رو باہ بازیوں کا نمائندہ ـــــ اور قارون، نظامِ سرمایہ داری کی ہوسِ خوں آشامی کا پیکر۔ لیکن جہاں تک فرعون کا تعلق ہے، اس نے بھی اپنی مملکت کے استحکام کے لئے قوم کے

ذرائع رزق کو اپنے قبضہ میں لے رکھا تھا۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰؑ نے وہاں انقلابی نعرہ بلند کیا تو اس نے اپنی قوم سے کہا :-

اے میری قوم کے لوگو! سوچو کہ کیا مصر کا ملک اور یہ نہریں جو میرے انتظام کے ماتحت جاری ہیں، اور جن پر تمہاری معیشت کا دار و مدار ہے، میری نہیں؟ (۴۳/۵۱)

یہ درحقیقت قوم کو بہت بڑی دھمکی دی گئی تھی کہ اگر تم میں سے کسی نے اس داعئ انقلاب کا ساتھ دیا تو اس پر معیشت کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے۔

فرعون کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کے تصادم کی داستان الگ ہے۔ اس کی تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں۔ جہاں تک نظامِ سرمایہ داری کے خلاف کشمکش کا تعلق ہے، قرآن کریم نے اس کے تذکرہ کی ابتدا ہی بڑے معنی آفریں انداز سے کی ہے جب کہا ہے کہ ــــــ اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ. (۲۸/۷۶) ــــــ فرعون تو ایک دوسری قوم کا آدمی تھا، جس نے بنی اسرائیل کو اپنی محکومیت کے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا، لیکن قارون خود قومِ موسیٰؑ کا فرد تھا۔ یعنی نظامِ سرمایہ داری کی خون آشامی کی یہ حالت ہے کہ اس میں کوئی باہر سے آکر قوم کا خون نہیں چوستا۔ خود قوم کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو لوٹتا ہے۔ دوسری مصیبت یہ ہوتی ہے کہ غیروں کی غلامی کی لعنت ہر کوئی محسوس کرتا ہے اور کسی بدترین غدار کے سوا، کوئی ان کا ہمنوا نہیں ہوتا۔ لیکن سرمایہ داروں کی عیش سامانیوں اور تن آسانیوں کو دیکھ کر، دوسرے لوگوں کے دل میں بھی ان جیسا بن جانے کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ قرآن کریم بتاتا ہے کہ

ایک طرف وہ لوگ تھے جو قارون کو زندگی کی صحیح روش اختیار کرنے کی نصیحت کرتے تھے اور دوسری طرف وہ تھے جن کے پیشِ نظر زندگی کی عیش سامانیاں تھیں - ان کی کیفیت یہ تھی کہ جب قارون کروفر اور شان و شوکت سے باہر نکلتا تو وہ بڑی حسرت سے کہتے کہ اے کاش! جو کچھ قارون کو ملا ہے، وہ ہمیں بھی مل جاتا - یہ بڑا ہی خوش نصیب ہے! (۲۸/۷۹)

جب قارون سے کہا جاتا کہ تم جو دوسری کی محنت کی کمائی کو اس طرح غصب کر کے اتنی دولت اکٹھی کر رہے ہو، تمہیں اس کا کیا حق پہنچتا ہے؟ تو معلوم ہے وہ اس کا کیا جواب دیتا؟ وہی جواب جو ہر دور میں ہر قوم کے سرمایہ پرست کی طرف سے ملتا ہے وہ کہتا : اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ. (۲۸/۷۸) یہ دولت میں نے اپنی ہنرمندی اور چابکدستی سے حاصل کی ہے۔ اس لئے کسی دوسرے کو کیا حق حاصل ہے کہ اس کی بابت مجھ سے کوئی بازپرس کرے؟

یہ کشمکش جاری رہی۔ اس کے بعد :-

جب قارون کی بدکرداریوں کے نتائج کے ظہور کا وقت آگیا۔ تو ہم نے اسے، اور اس کے مال و متاع سے بھرے ہوئے گھر کو تباہ کر دیا - اور اس وقت کوئی گروہ ایسا نہ نکلا جو قانون

خداوندی کے مقابلہ میں اس کی مدد کر سکتا، نہ ہی اس سے خود ہی ایسا ہو سکا کہ وہ اس تباہی سے بچ نکلتا۔ سرمایہ دار کی اقبال مندی کے زمانے میں ایسا نظر آتا ہے کہ ایک لشکر ہے جو اس کی خاطر اپنی جان تک قربان کر دے گا لیکن جب اس پر ادبار آتا ہے تو ایک شخص بھی اس کا ساتھ دینے والا نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس کی اپنی ہنرمندی اسے اس تباہی سے بچا سکتی ہے۔ (۲۸/۸۱)

حضرت داؤدؑ کے زمانے میں عام معاشی نظام کس قسم کا تھا، اسے قرآن کریم نے ایک قصہ کی شکل میں تمثیلی رنگ میں بیان کیا ہے۔ نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد اس پر ہے کہ بڑا سرمایہ، چھوٹی پونجی کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اور اس طرح امیر امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت داؤدؑ کے پاس ایک مقدمہ آیا جس میں:-

مستغیث نے کہا کہ فریقِ ثانی میرا اپنا بھائی ہے۔ لیکن دیکھو کہ یہ بھائی ہو کر میرے ساتھ کرنا کیا چاہتا ہے۔ اس کے پاس ننانوے دُنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک دُنبی جو میری معاش کا واحد سہارا ہے۔ اب بجائے اس کے کہ یہ اپنے غریب بھائی کی کچھ امداد کرے، مجھ سے کہتا ہے کہ اپنی ایک دُنبی بھی مجھے دے دے۔ چونکہ امیر آدمی ہے اور صاحبِ اثر بھی، اس لئے باتوں میں مجھے دبا لیتا ہے اور دوسرے لوگ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں ——— یہ ہے میرے اس بھائی کا میرے ساتھ برتاؤ۔ آپ بتائیے کہ کیا اس کا یہ مطالبہ جائز ہے؟ (۳۸/۲۳)

یہ تھا وہ غلط معاشی نظام جس کی اصلاح کے لئے حضرت داؤدؑ مامور ہوئے تھے۔ چنانچہ خدا نے آپ سے کہہ دیا کہ

(تم بلا خوف و خطر، اطمینان سے معاشرہ کی اصلاح کرو)۔ ہم نے تمہیں حکومت عطا ہی اس لئے کی ہے کہ تم لوگوں کے معاملات کے فیصلے حق کے ساتھ کیا کرو۔ اور کسی کے خیالات اور جذبات کے پیچھے مت لگو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ لوگ تمہیں راہِ راست سے بہکا دیں گے۔ (۳۸/۲۶)

مسیحِ انسانیت، حضرت عیسےٰؑ کی تو دعوت ہی ایک طرف "سود خوار یہودیوں" کے خلاف چیلنج، اور دوسری طرف رومیوں کی مستبد حکومت کے خلاف بغاوت تھی۔ لیکن سود خوار یہودی خود سامنے نہیں آتا تھا۔ جس طرح فرعون نے، مذہبی پیشوائیت (ہامان) کو حضرت موسےٰؑ کے خلاف اٹھا کھڑا کیا تھا۔ اسی طرح سرمایہ پرست یہودی ہیکل کے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کو آپ کے سامنے لے آئے تھے۔ اس آسمانی دعوت کی زد، ان مذہبی پیشواؤں پر کس طرح پڑتی تھی، اس کے متعلق انجیل برناباس کا

ایک اقتباس درج کر دینا کافی ہوگا۔ اس انجیل کی فصل ۱۴۲ میں ہے۔

> تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے خلاف مشورہ کیا اور کہا کہ اگر یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے۔ البتہ ہم پہ یہ بہت بڑی مصیبت ہوگی۔ اس لئے، کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقے کے مطابق اصلاح کرنی چاہتا ہے کیونکہ وہ تقالید (رسومات) کو باطل کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ تب اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہوگا۔ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے اس لئے کہ ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے تو ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پہ مانگیں۔

یہ وجہ تھی جو ہیکل کے احبار و رہبان، حضرت عیسیٰؑ کی اس انقلاب آفریں دعوت کی اس شدت سے مخالفت کرتے تھے۔

جب حضور خاتم الانبیاءؐ کی وساطت سے دین اپنی آخری اور مکمل شکل میں نوعِ انسانی کو دیا گیا تو نظامِ سرمایہ داری کے حاملین کی طرف سے اس کی مخالفت بھی اپنی انتہائی شدت تک پہنچ گئی۔ ہمارے ہاں عام طور پہ نبی اکرمؐ کی بعثت مقدسہ کا مقصد اتنا ہی بتایا جاتا ہے کہ عہدِ جاہلیت میں عربوں میں قمار بازی، جوئے بازی، باہمی جنگ و جدال، توہمات رسومات عام تھیں۔ حضورؐ ان قبیح رسومات کی اصلاح کے لئے تشریف لائے تھے۔ وہ لوگ بت پرست تھے اور آپؐ اسے شرک قرار دیتے تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ قریشِ مکہ اور ان کے ساتھ جملہ قبائلِ عرب نے جو اس دعوت کی مخالفت میں جانوں تک کی بازی لگا دی تھی تو کیا اس کی وجہ محض اتنی تھی کہ وہ ان عادات و رسومات کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے، جو عام اخلاقی اصولوں کی رُو سے بھی قابلِ مذمت اور درخورِ نفرت تھیں۔ زیادہ سے زیادہ ان کی بت پرستی کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ تو اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہی قابلِ غور ہے کہ قرآن کریم نے مسلمانوں کو تاکید کر دی تھی کہ اُن کے معبودوں کو گالی تک نہ دیں —— لہٰذا، ان کے اندازِ تبلیغ میں اشتعال انگیزی کا عنصر موجود ہی نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ قرآن کریم کی رو سے مسلمان غیر مسلموں کو ان کے مذہب سے (خواہ وہ بُت پرستی ہی کیوں نہ ہو) زبردستی روک نہیں سکتے تھے۔ تو پھر وہ کون سی بات تھی جس کی وجہ سے یہ سارا ملک اس دعوت کے خلاف میدانِ کارزار میں اتر آیا تھا۔ بالخصوص جب یہ جماعتِ مومنین مکہ چھوڑ کر مدینہ چلی آئی تھی تو پھر قریش کو کس بات کا خطرہ تھا جو انہوں نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اور چھ سات سال تک مسلسل معرکہ آرائیاں ہوتی رہیں۔

اس اہم سوال کا جواب ایک غیر مسلم نے دیا ہے جس نے تاریخ کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا تھا۔ بات یوں ہوئی کہ جب چین میں امریکہ کے پٹھو، چیانگ کائی شک، کو کمیونسٹوں کے ہاتھوں بُری طرح شکست ہوئی تو اس سے امریکہ کو جس قدر خفت اٹھانی پڑی وہ ظاہر ہے۔ اہلِ امریکہ حیران اور متعجب تھے کہ ان کی اس قدر امداد کے باوجود چیانگ کائی شک اس طرح خاسر و نامراد کیوں رہ گیا۔ اس کی (یا خود اپنی) سیاست

کی) اس ناکامی کی وجہ دریافت کرنے کے لئے اکثر امریکی دیدہ ور چین پہنچے۔ ان میں ایک نامور جرنلسٹ (JACK BELDEN) بھی تھا۔ اس نے وہاں کی سیاحت کے بعد ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا (CHINA SHAKES THE WORLD) وہ اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھتا ہے کہ تاریخ کے اس تحیر انگیز واقعہ (یعنی انقلابِ چین) کے اسباب و علل دریافت کرنے کے لئے۔

نہ تو حکومتِ امریکہ اور امریکی پریس، نہ ہی امریکہ کے عوام اور ان کے وہ نمائندے جو مشرقِ بعید کے قونصل خانوں میں بیٹھے ہیں، نہ کاروباری حلقہ اور نہ ہی فوجی ادارے، اپنی نگاہ کو اپنے ذاتی یا قومی مفاد کی تنگ حدود سے آگے لے جاتے ہیں تاکہ وہ اہلِ چین کے درد آگیں اور جذبات سے لبریز قلوب تک پہنچ سکیں۔

اس کے بعد بیلڈن اس انقلابِ عظیم کی حقیقی وجہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:۔

ان تمام لوگوں کو، جو اس انقلاب کی صحیح علت معلوم کرنا چاہتے ہیں، محمدؐ کے ان الفاظ کی یاد دلا دینا چاہیئے جو وہ مکہ کے تاجروں سے کہا کرتے تھے کہ

كَلَّا - بَلْ لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ - وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ۔ (۸۹/۱۷-۱۹)

نہیں! تمہاری تباہی کی وجہ وہ نہیں جو تم سمجھے بیٹھے ہو۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ تم اس شخص کو واجب التکریم نہیں سمجھتے تھے جو معاشرہ میں تنہا رہ جائے اور ایک دوسرے کو اس شخص کی مدد کرنے کی تلقین نہیں کرتے تھے جس کی چلتی گاڑی رُک جائے۔

یہ تھا آپؐ کا وہ انقلاب آفریں پیغام جس کی وہ لوگ مخالفت کرتے تھے۔ آپؐ، ان کے پورے کے پورے معاشرتی اور معاشی نظام کو بدلنا چاہتے تھے۔ قریش بہت بڑے تاجر تھے۔ اتنے بڑے کہ (قرآن کے الفاظ میں)

رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ۔ (۱۰۶/۲)

ان کے کاروانِ تجارت، سردی، گرمی، سارا سال، رواں دواں رہتے تھے۔

ایک طرف تجارت، اور دوسری طرف کعبہ کی تولیت۔ اس سے ان کا پورا معاشی نظام، سرمایہ داری پر متفرع تھا۔ اور اس داعیٔ انقلابؐ کا پیغام، اس نظام کو ختم کرنے کا مدعی تھا۔ وہ اس کی اس طرح مخالفت نہ کرتے تو اور کیا کرتے؟ ان سرمایہ داروں کے سب سے بڑے نمائندہ، ابوجہل نے، جب غلافِ کعبہ کو تھام کر اس تحریکِ جدید کے خلاف اپنے معبودوں سے فریاد کی تھی تو اس میں اس نے کہا یہ تھا کہ یہ پیغام وہی ہے جو فارس میں ابھی ابھی مزدک[1] لایا تھا۔ محمدؐ کو یہ سبق (معاذ اللہ) سلمان فارسیؓ نے پڑھایا ہے ؎

ایں مساوات، ایں مواخات اعجمی است
خوب می دانم کہ سلمان مزدکی است

---

[1] ایران میں اشتراکیت کا داعی

انہوں نے حضورؐ سے مفاہمت کی صورت پیدا کرنے کے لئے اپنا جو نمائندہ بھیجا تھا ـــــ اس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ـــــ فَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَّمْدُوْدًا (۱۲/۷۴)۔ اسے بڑی فراواں دولت حاصل تھی۔ ان مخالفین سے جب کہا گیا کہ یاد رکھو! اگر تم نے اپنی روش کو نہ چھوڑا تو تمہارا حشر بھی وہی ہوگا جو تم سے پہلے تمہارے جیسی قوموں کا ہوا تھا۔ وہ تم سے بھی زیادہ مال و دولت اور قوت و حشمت کی مالک تھیں ان کی بڑی بڑی بستیاں تھیں (۹/۷۰) جن کے اب صرف کھنڈرات باقی رہ گئے ہیں۔ (۲۹/۵۸) اس لئے تم جو اپنے مال و دولت پر اتراتے ہو، تو تمہارا انجام بھی انہی جیسا ہوگا۔ اس لئے کہ یہ خدا کا اٹل فیصلہ ہے کہ

جو شخص مال اور دولت جمع کرتا ہے اور پھر نافرمانی کے پھیر میں پھنس جاتا ہے۔ تو اس کا انجام تباہی ہوتا ہے۔ (۱۰۴/۱-۳)

تم "ربِ کعبہ" کی طرف نسبت رکھنے سے اس قدر مفاد حاصل کرتے ہو کہ نہ تمہیں رزق کی کمی کا اندیشہ ہوتا ہے نہ کسی قسم کا خوف و خطر لاحق۔ تو تمہیں چاہیئے کہ محکومیت بھی اسی رب کی اختیار کرو۔ (۱۰۶/۱-۴) لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور اپنی مخالفت میں تیز سے تیز ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ جب ان کی ہلاکت بہ ہمان کے انجام کی خبر تصدیق ثبت ہو گئی تو قرآنِ کریم نے ان کے نمائندہ (ابولہب) کا نام لے کر، ان کی تباہی کے سلسلے میں کہا کہ مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ۔ (۱۱۱/۲) اس کا اس قدر مال و دولت جو اس نے حاصل کر رکھا تھا، اس کے کسی کام نہ آیا۔"

"قرآن کا معاشی نظام" سردست میرا موضوع نہیں۔ میں اس عنوان پر بہت کچھ لکھ چکا ہوں ـــــ قرآنِ کریم کا مطالعہ اس نگاہ سے کیا جائے، تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام، نظامِ سرمایہ داری کے خلاف کھلا ہوا چیلنج ہے اور جو دین (نظامِ زندگی) وہ پیش کرتا ہے، اس کی مخالفت کے اقنومِ ثلاثہ (ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری) میں، سرمایہ داری کو برابر کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں کہدیا ہے کہ

(اس باب میں ایک اصولی حقیقت کو ہمیشہ سامنے رکھو اور وہ یہ کہ) کوئی قوم اور بستی ایسی نہ تھی کہ اس میں ہم نے اپنے رسول کو بھیجا ہو جو انہیں ان کی غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتا تھا۔ اور وہاں کے آسودہ حال، دولت مند سرمایہ دار طبقہ (مترفین) نے اس کی مخالفت نہ کی ہو۔

وہ کہتے یہ تھے کہ ہمارے پاس مال و دولت کی فراوانی ہے اور ہمارا جتھہ بھی بہت بڑا ہے۔ اس لئے کس کی مجال ہے جو ہمارا بال بھی بیکا کر سکے۔ (۳۴/۳۴)

یعنی اس وقت تک جو بات جزءً جزءً بیان ہو رہی تھی، قرآنِ کریم نے اسے ایک کلیہ کی حیثیت سے بیان کر کے دین اور نظامِ سرمایہ داری کے باہمد گر متضاد اور نقیض ہونے کی حتمی شہادت بہم پہنچا دی۔ یعنی خدا کی طرف سے جہاں اور جب بھی دین آیا، مترفین نے اس کی مخالفت کی۔ اس میں کوئی استثنا نہیں۔ ہر جگہ اور ہر زمانے میں ایسا ہی ہوا۔ ان کے پاس ان کی اس مخالفت کی دلیل فقط یہ ہوتی تھی کہ نظامِ سرمایہ داری

ہمارے آباؤ اجداد سے متواتر چلا آ رہا ہے۔ ہم اس سے ہٹ نہیں سکتے۔

اور اسی طرح ہم نے کسی بستی میں اپنا رسول نہیں بھیجا کہ وہاں کے دولت مند طبقہ (مترفین) نے یہ نہ کہا ہو کہ ہم نے اپنے اسلاف کو جس راستے پہ چلتے دیکھا ہے، ہم اس راستے سے ایک قدم بھی ادھر ادھر ہٹنے کے لئے تیار نہیں (۴۳/۲۳)

سورۂ "انبیاء" میں ان لوگوں کے انجام کو بڑے ڈرامائی انداز میں سامنے لایا گیا ہے جہاں قرآن کی مخاطب قوم سے کہا گیا ہے کہ

اگر تم نے اپنی زندگی کا نقشہ قرآن کے مطابق مرتب کر لیا تو تمہیں عظمت اور بلندی حاصل ہو جائے گی۔ اگر اس کے خلاف چلے تو تم بھی اسی طرح تباہ ہو جاؤ گے جس طرح تم سے پہلے کتنی ایسی قومیں تباہ ہو گئیں جنہوں نے ظلم اور ناانصافی پہ کمر باندھ رکھی تھی۔ وہ تباہ ہو گئیں اور ان کی جگہ دوسری قوموں نے لے لی۔

ان کی غلط روش کے نتائج غیر محسوس طور پہ مرتب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ انہیں ان کے انجام سے آگاہ کیا جا رہا تھا کہ وہ اس روش سے باز آ جائیں۔ لیکن وہ اس تنبیہ پہ کان نہیں دھرتے تھے۔ چنانچہ وہ غیر محسوس نتائج آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے۔ حتیٰ کہ جب وہ محسوس طور پر سامنے آ گئے تو وہ اس تباہی سے بچنے کے لئے لگے بھاگنے۔

لیکن اس وقت بھاگنے کا کون سا موقع تھا۔ چنانچہ ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں للکارا اور کہا کہ اب بھاگ کر کہاں جا سکتے ہو۔ مت بھاگو۔ اب الٹے پاؤں اپنی انہی عیش سامانیوں کی طرف چلو (مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ) جن کی سرشاریاں تمہیں اس قدر مدہوش کئے ہوئے تھیں۔ اور اپنے ان محلات کی طرف پلٹو جن کے اندر تم اپنے آپ کو اس قدر محفوظ تصور کیا کرتے تھے۔ وہاں چلو، تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ کچھ کس کی محنت سے بنا تھا اور تمہارا اس پہ کیا حق تھا۔ (۲۱/۱۱-۱۴)

قوموں کی تباہی کے سلسلہ میں قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ جب کسی قوم کی بربادی کے دن قریب آ جاتے ہیں۔ تو اس کا سرمایہ پرست طبقہ ہوسِ زراندوزی میں حدود فراموش ہو جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت اس قوم پہ بری طرح مسلط ہوتی ہے اور وہ صحیح روشِ زندگی کو چھوڑ کر غلط راہیں اختیار کر لیتی ہے۔ تو پھر وہ اس طرح ہلاک ہو جاتی ہے کہ اس کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔ (۱۷/۱۶)

سورۂ ھود میں ہے کہ تم اقوامِ گزشتہ کے احوال و کوائف پر نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ اس سے تم کس نتیجہ پہ پہنچتے ہو۔ کیا اس نتیجہ پہ نہیں کہ

جو لوگ تباہی سے بچ جاتے، ان میں سے بعد میں معدودے چند ایسے رہ جاتے جو اپنے مفاد کو قوانینِ خداوندی کے مطابق حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور لوگوں کو ناہمواریاں پیدا کرنے سے روکتے۔ ورنہ باقیوں کا تو یہ حال ہو جاتا کہ وہ اپنی تن آسانی اور مفاد پرستی کے پیچھے لگے رہتے اور دوسروں کا سب کچھ لوٹ کھسوٹ کرتے جاتے، تاکہ ان کی عیش سامانیوں میں

فرق نہ آنے پائے۔ (خواہ باقی انسانوں پہ کچھ ہی کیوں نہ گزرے) یہ تھے ان کے وہ جرائم جن کی بنا پر ان کی بربادی ہوتی۔ (۱۱/۱۱۶)

قوموں کی تباہی کے وقت سب سے زیادہ عذاب اسی سرمایہ دار طبقہ پر وارد ہوتا ہے :-

حَتّٰىٓ اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْــَٔرُوْنَ ۔

تاآنکہ اس قوم کا مرفہ الحال، سرمایہ دار طبقہ عذاب میں گرفتار ہو جاتا ہے' اور وہ کس بُری طرح سے چیختا چلاتا ہے۔ (۲۳/۶۴)

قرآنِ کریم کی تصریحات آپ کے سامنے آ چکیں۔ ان سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ دینِ خداوندی کی رُو سے سرمایہ پرستی کی پوزیشن کیا ہے۔ لیکن اگر آپ کو اب بھی کسی قولِ فیصل کا انتظار ہے تو اُسے بھی سن لیجئے۔ جہنم کے شعلے بھڑک رہے ہیں اور اس میں پڑے ہوئے لوگ چیخ چلا رہے ہیں۔ پوچھنے والا پوچھتا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں اور انہوں نے کیا جرم کیا تھا جو یہ اس قدر شدید عذاب میں مبتلا ہیں؟ سوال آپ نے سن لیا۔ اب جواب ملاحظہ فرمائیے۔ کہا کہ

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ۔ (۵۶/۴۵)

یہ سابقہ سرمایہ داروں کا طبقہ ہے۔

شکریہ

بے شمار احباب کی طرف سے، حسبِ معمول، جشنِ نزولِ قرآن (عید الفطر) کی تقریب پر مبارکباد کے خطوط موصول ہوئے۔ چونکہ اس بار میری سالگرہ بھی' اسکے قریب ہی واقعہ ہوئی تھی اسلئے بہت سے احباب نے اس پر بھی پیغاماتِ تہنیت بھیجے۔ میرے لئے ان احباب کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرنا ممکن نہیں اس لئے ان سے درخواست ہے کہ وہ اس اجتماعی' شکریہ کو قبول فرمائیں۔ جن نیک تمناؤں کا انہوں نے میرے لئے اظہار فرمایا ہے میں ان کے لئے ان کا (بلکہ ان سے بھی زائد کا) اعادہ کرتا ہوں۔

میں نے اپنی سالگرہ کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ یہ عمر کا حساب ہے جس کا شمار ماہ و سال کی رُو سے ہوتا ہے۔ انسان کے لئے عمر وجہِ خصوصیت نہیں۔ عمر تو حیوانات کی بھی ہوتی ہے۔ اصل اہمیت زندگی کو حاصل ہے جو بلند مقاصد کے پیمانوں سے ماپی جاتی ہے۔ کسی کی عمر میں جس قدر زندگی کا حصہ ہوگا اسی قدر اس کا شمار انسانوں کے زمرہ میں ہوگا۔ موت سے آدمی کی عمر کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور اسکی زندگی آگے چلتی ہے۔ خوش بخت ہیں وہ جن کے لئے احباب یہ دعا کریں کہ انہیں زیادہ سے زیادہ زندگی عطا ہو۔ احباب کی یہی دعائیں باعثِ شکرگزاری ہوتی ہیں۔

والسلام رہینِ منت پرویز